ایک اور دن کوپرنام

(افسانے)

ایک اور دن کو پرنام

(افسانے)

رام لعل

سیمانت پرکاشن
دریا گنج نئی دلی ۲ - ۱۱

قیمت ساٹھ روپے -/۶۰
اشاعت ۱۹۹ء
تعداد ایک ہزار
سرورق وصیلت
طباعت لکشمی پریس، دریا گنج، نئی دہلی-۲

ناشر: ریدر ناتھ سوز
سیمانت پرکاشن
۹۲۲، کوچہ روہیلا، تراہا بہرام
دریا گنج، نئی دہلی-۲ ۱۱

LI AUR DIN KO PRANAM
SHORT STORIES

RAMLAL
Rs 60.00

SEEMANT PRAKASHAN
922 Kucha Rohella Khan
Darya Ganj NEW DELHI-110002

एक और दिन को प्रणाम

लेखक
राम लाल

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام

فہرست

عرضِ ناشر /۹

کئی سال پہلے کا وہی دن /۱۱

پستی کی ماں /۲۳

ایک اور دن کو پرنام /۳۴

ایک نئے شہر جیسا /۴

ایک جانور کی کتھا /۵۳

سیڑھیاں /۶۱

کھلی آنکھوں کی تصویر /۶۶

ایک ویراگی کی پریکشا /۷۵

ایک شام لاھور کے نام / ۸

لاکھوں میں ایک / ۹۱

ایک قطرہ مثالِ دریا / ۱۰۲

متبادل / ۱۰۸

کیسے کیسے لوگ / ۱۱۵

جینے کی مہلت / ۱۲۶

ایک ٹرک تارا میں / ۱۳۳

اُداس اُداس ستمبر / ۱۴۲

مرڑے تاپ کی مٹی / ۱۵۶

لاحاصل خوابوں کی گنتی / ۱۶۷

دو آزردہ لمحوں کا حساب / ۱۸۰

تمام رات دھمال کے دھما دھما کر چراغ / ۱۸۷

ایک میٹھی ہری ہری پتیوں والی / ۱۹۶

آہٹ سی درِ دل پر / ۲۰۸

عرضِ ناشر

رام لعل کا شمار اس وقت اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ رام لعل کے قارئین کی خدمت میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ یورپ، روس، امریکہ، کینیڈا اور عرب کے خلیجی ممالک میں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، گزشتہ دس برس میں ان کی درج ذیل تصانیف پیش کی ہیں

ریل دھارا (ناول)
رام لعل کے منتخب افسانے
اُردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا (تنقید)
اُکھڑے ہوئے لوگ (نیا ترمیم شدہ ایڈیشن)
آنے والے کل کے سپاہی (بچوں کے لیے کہانیاں)
ڈیڈی کی چوری (ایضاً)

ایک اور دن کو پرنام، ان کے افسانوں کا سولہواں مجموعہ ہے ان کے افسانوں کے

بعض ایڈیشن پاکستان اور سوئیڈن میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بعض مجموعے جو اب دستیاب نہیں، کے نئے ایڈیشن چھاپنا ہمارے آئندہ منصوبوں میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں 'چراغوں کا سفر' بہت جلد پیشِ خدمت ہوگا۔

رام لعل کے افسانوں کے متعدد ترجمے اردو کے علاوہ ہندی، کنڑا، ملیالم، تامل، اڑیا، گجراتی، مراٹھی، آسامی، پنجابی، سندھی وغیرہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ غیر ملکی زبانوں میں روسی اور ڈینش میں بھی موجود ہیں اور ان کے انگریزی افسانوں کا ایک مجموعہ بہت جلد سوئیڈن سے پیش کیا جا رہا ہے۔

رام لعل نے خواجہ احمد عباس اور اپیندر ناتھ اشک کے افسانوں کے انتخاب کیے ہیں جن میں سے اوّل الذکر مجموعہ ہمارے ادارے سے شائع کیا گیا ہے۔

رام لعل نے پاکستان، روس، ناروے، انگلینڈ، سوئیڈن، ڈنمارک، فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے متعدد سفر کیے ہیں۔ اور اپنی سیاحت کے تجربات کو دو ضخیم سفرناموں 'زرد پتوں کی بہار' (پاکستان) اور 'خواب خواب سفر' (یورپ) کی صورت میں پیش کر چکے ہیں جو ان کی شہرت اور اہمیت میں بے پناہ اضافہ کے باعث ثابت ہوتے ہیں۔

رام لعل جیسی ہمہ گیر شخصیت اس بات کی بجا طور پر متقاضی تھی کہ ان کی شخصیت اور فن پر بھی کوئی مبسوط تصنیف شائع ہوتی۔ چنانچہ یہ فرض بھی راقم السطور نے نبھایا اور ایک اہم کتاب "رام لعل، شخصیت اور فن" کے عنوان سے پیش کی جس میں وارث علوی، محمود ہاشمی، انور سدید، سلیم اختر، آغا سہیل، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، سید ستار مصطفیٰ، غیاث اقبال، علی احمد فاطمی، سید احمد قادری (جو رام لعل پر ریسرچ بھی کر رہے ہیں) وغیرہ کئی اور مستند نقادوں کے بھی مضامین شامل ہیں۔

رام لعل کے تازہ ترین افسانوی مجموعہ میں کئی ایسے اہم افسانے شامل ہیں جو اردو افسانے کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔

——— نریندر ناتھ سوز

کئی سال پہلے کا وہی دن

بیشتر زخم وقت کے ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں، اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑ جاتے'
یہ جملے سریتا کے پتی نے ہنستے ہنستے کئی بار کہے ہیں پتہ نہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے یہ وہ آج
تک نہیں جان سکی اس کے ساتھ اس کے پانچ سال بیت چکے ہیں لیکن اسے یہ یقین نہیں ہو سکا کہ
مہندر سانگ نے کبھی کسی سے واقعی محبت کی ہوگی اپشپا اس کی زندگی میں بیس سال پہلے آئی تھی اس
سے بھی وہ محبت کا اظہار نہیں کرتا لیکن پشپا نے اس بات کی کبھی شکایت بھی نہیں کی وہ اسی بات سے
مطمئن نظر آتی ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے سریتا تو بہت بعد میں آئی ہے اس کے ساتھ بھی اس کی
شادی محبت کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی ہندوستان میں بیشتر لوگ شادی کے بعد ہی محبت کرنے کا دعویٰ کرتے
ہیں۔ مانگ نے تو یہ دعویٰ بھی ابھی تک نہیں کیا ہے وہ دونوں بیویوں کی موجودگی کو گھر کے بہت ضروری
سامان کی طرح سمجھتا ہے فریج، ورج، ٹی وی، قالین، موٹر کار وغیرہ کی طرح اور جس طرح وہ ان ساری
چیزوں کی دیکھ ریکھ کرتا ہے اسی طرح پشپا اور سریتا کی بھی۔ دونوں کی صحت ٹھیک رہنی چاہیئے۔ دونوں
کو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے اور گہنے وغیرہ ملتے رہنے چاہیئے اور وہ اپنی من پسند غذائیں پوری آزادی سے
کھا سکیں اور اپنے اپنے رشتے داروں سے بلا روک ٹوک مل سکیں اور وہ دونوں کے ساتھ اس قدر
نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہے کہ انہیں ایک لمحے کو بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ان پر دل وجان سے

نداہیں ہے۔

مرتا ناسنگ نے اُس کی زندگی میں آنے سے پہلے اُس کی ان ساری خصوصیات کا اندازہ کر لیا تھا اور یہی سوچتا تھا کہ وہ پوری طرح مطمئن رہے گی جب اُسے یہ تک یقین دلایا گیا تھا کہ پشپا نارنگ اپنی سوت کے ساتھ حسد نہیں کرے گی تو وہ اس سمجھوتے کو قبول کیوں نہ کرتی۔ اُسے ایک پتی کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے ہی ایک پتی کی جس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ اُسے مل چکا تھا لیکن وہ ہر خوبصورت اور جوان بیوی کی طرح یہ بھی گھات لگائے رہی کہ رفتہ رفتہ اپنے آدمی پر پورا قبضہ کر ہی لے گی۔ جو عمر میں اُس سے تیس برس بڑا ہے۔ بڑی عمر کے پتی زیادہ بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ جوان بیویوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ وہ اس کی بڑھیا کو بڑی آسانی سے کسی روز ایک الگ کونے میں ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہو۔ اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور صدمہ بھی پہنچا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ اس کی حیثیت گھر میں ایک جونیئر وائف کی سی ہے، جسے ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت یہ اس کے لیے ایک شکست ہے۔ اُس کی انا کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اسی کشمکش سے بچنے کے لیے اُس نے پھر سے یونیورسٹی کی ملازمت لے لی تھی جسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے وہ اس گھر میں آئی تھی۔ لیکن اب وہ روزانہ پڑھانے کے بہانے سے اس ماحول سے چند گھنٹوں کے لیے دور چلی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی مصروفیات نے رفتہ رفتہ اُسے ایک دوسری راہ پر ڈال دیا ہے۔ جس میں مسرت و سکون ہے اور انٹلیکچول طریقے سے ساری باتوں پر غور کرنے کی تحریک بھی مل جاتی ہے۔ جب کبھی وہاں کوئی فنکشن ہوتا ہے اور مہندر اس کے ساتھ ہوتا ہے، وہ کبھی کبھی اُسے وہاں ڈراپ کرنے کے لیے یا واپس لے جانے کے لیے آ جاتا ہے تو اُسے اچانک اپنا وجود بہت اہم لگنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس کے سامنے کسی کی ملکیت ہونے کے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ان لمحوں کو یکسر فراموش کر بیٹھتی ہے کہ اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے!

گھر لوٹ کر وہ ایک تکلیف دہ معمول میں پھنس جاتی ہے۔ ایک اس کا اپنا کمرہ ہے جہاں اُس کی تعلیمی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں، ایک آرام دہ صوفہ ہے، ایک رائٹنگ ٹیبل ہے جس پر ہر وقت ایک ٹائپ رائٹر اور بڑے خوبصورت اسٹینڈ والا لیمپ تیار رہتا ہے اور اسی میز کے قریب اُس

کا ایک چوڑا آرام دہ پلنگ پڑا ہوا ہے، جس پر وہ اکثر و بیشتر تنہا ہی سوتی ہے۔ مہدی کبھی کبھی اچانک آ بھی جاتا ہے تو زیادہ دیر تک نہیں رُکتا۔ اور اس کمرے کے ساتھ ہی ملحق اس کا اپنا صاف ستھرا باتھ روم ہے اور اس کمرے کے باہر لمبا سا گول برآمدہ ہے اور ایک شاندار ڈائننگ روم ہے جہاں گھر کے سارے افراد مقررہ وقت پر گانگ کی آواز سنتے ہی ناشتے اور کھانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے گھر کے سارے ملازم بھی گھر کے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ہر شخص ایک خاص مقررہ تنخواہ پاتا ہے اور ایک خاص مقررہ ڈیوٹی سرانجام دیا کرتا ہے اور وہ سب بھی اس ٹھنڈے گھریلو نظام سے پوری طرح مطمئن نظر آتے ہیں اس گھر کے دونوں ایلسیشین تک بڑی خاموشی سے گھومتے رہتے ہیں یا زنجیروں سے بندھے ہوئے خاموش پڑے رہتے ہیں اس نے کبھی کسی کی اونچی آواز نہیں سنی ہے کسی کو کسی بات پر پروٹسٹ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ پروٹسٹ تو اس نے بھی کبھی نہیں کیا۔ لیکن اس کے اندر ایک احتجاج یقیناً موجود رہتا ہے جسے ہی وہ اُسے دبا کر رکھتی ہے اور کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی ہے مہدی نے اُس کے ساتھ شادی کیوں کی ہے؟ وہ اس گھر میں نہ آئی ہوتی تب بھی اس گھر کے معمولات میں ذرا سا بھی فرق نہیں آتا۔ مہدی نے اُسے اپنی بیوی بنا کر اپنی کون سی ضرورت پوری کرلی ہے؟ اس کے گھر میں اتنے زیادہ شوپیس موجود ہیں اُن میں ایک اور اضافہ نہ ہوا ہوتا تو کون سا بڑا فرق پڑ جاتا یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کے مہمانوں کے ساتھ بڑی اچھی گفتگو کرلیتی ہے پولٹکس، سماجیات اور کبھی کبھی لٹریچر پر بھی اگر کوئی مہمان واقعی اس ذوق کا مالک ہوتا ہے۔ مہمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خالص تجارتی ذہن کے' اونچی سیاسی سطح کے۔ پروفیشنل بیوروکریسی سے قریبی تعلق رکھنے والے اور کبھی کبھی کوئی منسٹر یا گورنر بھی آ نکلتا ہے اُسے ایسے مہمانوں کے ساتھ محو گفتگو یا اُن کے درمیان اُٹھتے بیٹھتے دیکھ کر مہدی واقعی بہت خوش نظر آتا ہے لیکن وہ اُسے بار بار اس طرح خوش کر کے بھی اس پر اپنا تسلط نہیں جما پاتی ہے وہ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ وہ ہے ایک باوقار مطمئن، مہذب اور جامد آسودہ لینڈ لارڈ جس کی جائیداد بہت کھوئی ہوئی ہے بڑے بڑے لان اس نے رہائشی یا تجارتی پلاٹوں میں تبدیل کر دیے ہیں بہت کچھ بیچ بھی چکا ہے سیلنگ کے ڈر سے شاید سیلنگ کے ہی ڈر سے مہدی نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی تاکہ ایک

نہیں یاد ہے کہ ایک دن انہوں نے اسے صبح سویرے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اس وقت وہ ایک میز
کے سامنے بیٹھا حسب معمول شیو بنا رہا تھا۔ شیو بناتے بناتے وہ اس کے ساتھ جائیداد کے بارے میں بھی کچھ
گفتگو کرتا رہا تھا۔ جس بلڈنگ کو اس نے ایک کرسچین بیگ کے حوالے کر رکھا تھا، اسی کو وہ اس کے نام لکھ دینا
چاہتا تھا وہ جائیداد کی اتنی بھوکی نہیں تھی، اس لیے وہ اس کی ساری گفتگو بھی نہیں سن سکی تھی اس کی نظر
شیونگ کریم کی ٹیوب پر لگی رہی تھی۔ جسے اس نے ابھی ابھی ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔ ٹیوب کے اندر آدھی سے
کم ہی کریم ہو گی لیکن اس کے بیرونی حصے پر کوئی شکن نہیں پڑی تھی جس طرح وہ زندگی کے دوسرے معاملات
میں بہت ہی زیادہ احتیاط سے کام لینے کا عادی تھا، ویسی ہی احتیاط وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو
استعمال کرنے میں بھی برتتا تھا ایسی ہی شیونگ کریم کی ایک ٹیوب کو اس نے کئی برس پہلے آدرش کے پاس
دیکھا تھا جو بالکل پچکی اور مڑی ہوئی تھی اور اس کی ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی بھی ویسی ہی گت بنی ہوئی تھی۔ اس
نے آدرش سے مصنوعی غصے سے پوچھا تھا۔ "اوہ! تم کس قسم کے وحشی ہو! اتنی نرم و نازک چیزوں کو بھی
ایسی بے رحمی سے استعمال کرتے ہو!"

آدرش بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا ــــ "تم نے شاید ان چیزوں میں اپنے آپ
کو دیکھ لیا ہے سچ سچ کہنا تم ڈر گئیں نا کہ کہیں میں تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہ کر دوں؟"
وہ خاموش سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ آدرش نے جو کچھ کہا تھا، ممکن ہے سچ نکلتا۔ لیکن یہ بھی تو ایک سچ
تھا کہ وہ بہت زیادہ وحشی واقع ہوا تھا وحشی اور مطلب پرست۔ جب اس نے آدرش کے سامنے شادی
کا سوال رکھا تو وہ اپنے خاندان بھر کے جھگڑے لے بیٹھا فلاں فلاں بھائی بے حد قنوطی واقع ہوا
ہے میری فلاں موسی میرے خلاف طوفان برپا کر دے گی اور میرے بیوی بچے تو میری اس حرکت کو کبھی
معاف نہیں کریں گے، ہو سکتا ہے میرا لڑکا جو بے حد جذباتی واقع ہوا ہے، میری جان ہی لے لے۔
کیا تم چاہتی ہو، میں مارا جاؤں؟ میرے بغیر تم میرے گھر میں کیسے رہ پاؤ گی؟ سوچ لو۔"
مرینا کو یہ سوچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بہت بڑا سماجی بزدل تھا ــــ ڈیم سوسائٹی
کا ورڈ، مڈل کلاس میں بہادر عاشق شاذ و نادر ہی ملتے ہیں اس کا آدمی صرف تماشہ دیکھتا ہے۔
بڑی انٹلکچول قسم کی بحث کر لیتا ہے اور جوش بھی رہتا ہے۔ محبت کرتا ہے تو محض شغل کے طور پر، حسن

میں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو خطرہ ہو بھی تو وہ اس کی محبوبہ ہی کیوں نہ اٹھاتے۔ وہ ایک عرصہ تک اُسے ایک کھیل سمجھ کر اس سے ملتا رہا جب جی چاہتا اُس کے پاس پہنچ جاتا تھا اس کے ساتھ دو چار روز رہنے کے لیے ایک ٹورسٹ لاج میں کمرہ بک کرا لیتا تھا۔ معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لیے یہ کھیل بہت دلچسپ بن جاتا ہے وہ اسے ایک ایڈونچر سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں کیونکہ وہ بھی فطرتاً ایڈونچرس ہی ہوتی ہیں۔ انہیں بچپن ہی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکیں گی ــــ ماں باپ بھی انہیں ہر وقت یہ احساس دلاتے رہتے ہیں بہت زیادہ محنت کرتے ہیں، بہت اچھے کپڑے دیتے ہیں بہت اچھی تعلیم و تربیت بھی کہ دوسرے کے گھر میں جا کر ہمیشہ خوش و خرم رہ سکیں۔ اچھی لوگوں کے ساتھ اڈجسٹ کر سکیں اور اُن کا نام بھی روشن کر سکیں کہ فلاں گھر کی اولاد ہیں جو ماں باپ خود اُن کے لیے رشتے نہیں تلاش کر پاتے، اُن سے یہ توقع بھی رکھنے لگتے ہیں کہ وہ خود یا ساتھی تلاش کر لیں گی اس قدر کشادہ دل ہونے کے اشارے وہ کئی موقعوں پر دیتے رہتے ہیں سریتا اپنی زندگی کی بے شمار سوچوں کا سامنا کر کے آدرش تک پہنچی تھی۔ لیکن اس کا رویہ کسی کلی کو مسل لینے کا ہرگز نہیں تھا ــــ آدرش ایک کلی جیسا بھی ہرگز نہیں تھا، ایک خوش شکل خوش اطوار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر لیکچرار تھا دونوں کی ملاقات ایک یونیورسٹی کے تعلیمی سیمینار میں ہوئی تھی اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے شروع کی ملاقاتوں میں آدرش نے اُسے یہ تاثر ہرگز نہیں دیا تھا کہ وہ سماجی طور پر صد در صد متاہل واقع ہوا ہے۔ وہ اُسے ملنے ملنے محبت بھرے خط لکھا کرتا تھا۔ اس کے شہر میں آ جاتا تو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھاتا تھا ــــ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو ــــ اُس کے پیچھے جو کچھ بھی تھا ــــ بیوی، بچے، پوری دنیا ــــ اس سے جیسے دور ہو جانے کے لیے سریتا کے پاس چلا آتا ہے۔ سریتا نے اُسے اس حیثیت سے بھی قبول کر لیا تھا۔ اس نے کسی نوجوان مرد کے خواب دیکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کی قسمت میں ایسا ہی مرد ہوگا جو کسی روز اچانک اپنی بیوی اور بچوں سے الگ ہونے کے مسائل پر اس کے ساتھ گفتگو لے بیٹھے گا وہ اس قسم کی گفتگو میں حصہ لینے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھی لیکن اُس نے ایسی گفتگو کبھی نہیں چھیڑی جس کے لیے اس کے کان ہمیشہ ترستے رہے اگرچہ یہ سوچ سوچ کر اُسے دکھ بھی ہوتا تھا کہ آدرش اس جیسی ایک عورت کو چھوڑ کر اس کے پاس آنے کے لیے تیار نظر آتا ہے جو اس کے ساتھ کئی برس سے رہ رہی ہے۔ وہ اس سے بھی بے پناہ محبت کرتا ہے کیوں کہ اس نے کبھی بھول کر بھی اپنی بیاہتا بیوی کی برائی

نہیں کی ہے۔ اُس کے سِے ہوئے سوئٹر، اُس کی پسند کے خریدے ہوئے کپڑے وغیرہ ہر چیز بڑے فخر سے اُسے دکھاتا ہے اور پھر عجیب طرح سے خاموش بھی ہو جاتا ہے جیسے وہ اس سوچ میں مبتلا ہو کہ وہ اس دوسری عورت کی بھی بہت سی باتیں پسند کرنے لگا ہے۔ ذہنی ہم آہنگی اور کپڑوں وغیرہ کی پسندیدگی بھی ایک طرح محبت ہی ہوتی ہے۔ محبت کا ایک فطری اور صداقتی اظہار ـــــ ایک دوسرے کے دل تک پہنچنے کے لیے کئی راستے ہیں، کئی پگڈنڈیاں اور کئی سیڑھیاں ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے صرف پھول لیے تحفے لیکر نہیں آتے، اپنی اپنی آنکھوں میں محبت کی قندیلیں ہی روشن کیے ہوئے ایک دوسرے سے نہیں ملتے، نہ ہی اُن کے لیے ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کے لیے جسموں کی کشش اور گرمی اور خوشبو کافی ہوتی ہے ـــــ اُن کے لیے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے وہی کچھ جو ہر آدمی کی زندگی میں اس کے آس پاس ہوتا ہے ـــــ آدرش کے آس پاس جتنا کچھ تھا، اُسے سریتا مختلف اوقات میں دیکھتی اور پرکھتی رہی تھی۔ ایک بار وہ خوب گہری نیند میں اپنی بیوی کو نام لے کر پکار اٹھا تو اُس نے چونک کر پوچھا تھا ـــــ "تم نے ابھی اپنی بیوی کو پکارا تھا؟"

آدرش کتنے لمحوں تک اُس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا تھا۔ نیم بیداری کے عالم میں۔ جیسے اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ وہ اسے سینے کے ساتھ لپٹا کر پھر سو گیا تھا لیکن وہ سوچتی رہ گئی تھی کہ آدرش بہت بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ اُس سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی اپنی بیوی سے ـــــ ایک آدمی بیک وقت دو عورتوں سے بھی محبت کر سکتا ہے ایک سی شدت سے ـــــ جس طرح وہ اپنے دوستوں سے محبت کرتا ہے۔ کئی کئی دوستوں سے محبت کرنا اس کے لیے سماجی مسئلہ نہیں بنتا۔ لیکن ایک سے زیادہ عورتوں سے محبت کرنا یقیناً مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس معاملے میں عورت بھی آزاد نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانے ہیں اور خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں جنہیں توڑنے کے لیے وہ ترستا ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتا۔ آدرش نے اس کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لیے ایک ہی راستہ تجویز کیا تھا ـــــ کہ وہ اسی طرح ملتے جلتے رہیں لیکن سریتا نے اس پروپوزل کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ وہ اُسے باعزت نہیں لگتی تھی وہ خود بھی ایک سماجی رول تھی سماج کے ساتھ دور تک لڑنے کی اس کے اندر بھی ہمت نہیں تھی۔

ایک روز سریتا کو اپنی پرانی یونیورسٹی سے خط ملا۔ جہاں سے اس نے ایم اے کیا تھا پھر وہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی اور وہیں اُس نے کچھ عرصہ تک لیکچرار کے طور پر ملازمت بھی کی تھی ـــــ

وہاں اُسے ایک کلاس کا ڈپلوما لینے کے لیے جانا تھا۔ اس نے سوچا، ماحول میں تبدیلی کے لیے یہ موقع اچھا ہے
اُس نے اپنے ہسبنڈ کو بتایا تو اس نے اُسے فوراً اجازت دے دی۔ اس کے لیے ہوائی جہاز سے سیٹ بھی
بُک کرا دی اور حسن پور اس کی فلائیٹ تھی۔ ہسبنڈ مگر اُسے خود ہی گاڑی میں بٹھا کر ایئرپورٹ پر چھوڑ گیا
اپنے بچّوں سے چند روز کے لیے دور ہو جانے میں اُسے بڑا سکون ملا جیسے ایک لمبی قید سے پیرول
پر رہائی مل گئی ہو۔ اسے اسی ماحول میں پھر واپس چلے جانا ہوگا ـــــ حسن پور بے پناہ گھٹن تھی، بحد
حبس تھا۔ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ کر اُسے یاد آیا آج تو سترہ اپریل ہے۔ کئی برس پہلے وہ
اسی روز ٹورسٹ لاج میں پہلی بار آدرش سے ملی تھی۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس واقعہ کو آٹھ برس
سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اگرچہ وہ اس سے بعد میں بھی ملتی رہی اور کبھی کبھی انھیں وہی کمرہ مل گیا کبھی کبھی
نہیں ملا کسی کے لیے پہلے سے بُک ہو جانے کی وجہ سے۔ لیکن اس کمرے کی یاد اس کے دل سے کبھی نہیں
نکل پائی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں وہ پہلی مرتبہ ایک لڑکی سے عورت بنی تھی۔

سریتا کا جی چاہا اگر وہی کمرہ مل جائے تو وہیں جا کر قیام کرے۔ اپنا سامان ساتھ لے جانے سے
پہلے یوں ہی ٹہلتی ہوئی نکل پڑی۔

اس راستے پر کئی بار آدرش کے ساتھ چہل قدمی کر چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یونیورسٹی کے ٹیچروں
کے بنگلے تھے چھوٹے چھوٹے لان اور خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے یوکلپٹس اور رات کی رانی کے پیڑ، اور
پھولوں کی کیاریاں اور دیواروں سے لپٹی ہوئی بیلیں۔ کہیں کہیں ٹیچروں کی سادھارن سے دستروں
میں بیویاں، کوئی جوان، کوئی ادھیڑ، اور ادھر اُدھر کھیلتے ہوئے اُن کے بچّے۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں کھیت
اور اُن میں دھان کی پنیری لگاتے ہوئے کسان۔ سڑک پر جو بھی رکشا نکلا تو اس نے اس کے چالک کی اور
چونک کر دیکھا شاید کوئی اُسے جاننے والا مل جائے، جو اسے ہوسٹل سے ڈیپارٹمنٹ یا بستی میں لے کر
جایا کرتا تھا۔ اُسے کئی رکشا چالکوں کے نام یاد تھے سدانا، رام بلاس بکرجی، جہانگیر، ستائی۔ ستائی اگرچہ
بہاری تھا لیکن اُسے بہت سے بنگالی گیت یاد تھے۔ ہاسٹل کی لڑکیاں اُسے ڈرائنگ روم میں بلا کر اس
سے گیت سنا کرتی تھیں۔ وہ گیت گاتے گاتے رو پڑتا تھا تو لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے
دیکھتے ہوئی مسکرانے لگتی تھیں ـــــ کوئی پوچھتی۔ "اچھا ستائی دادا، بولو تو، تمرا کا دو ستو بگے بھالو
باشتا چھیلو؟ ـــــ سیتیہ اُدی چھیلو ما!" ستائی کو بہاری پسند نہیں کرتی ہوگی ـــــ اس کا پتہ تھا دلوہم

تیری سعادت کر سکتی ہیں۔"

سائی اپنی آنکھیں پونچھتے پونچھتے کہا اٹھتا تھا ۔۔۔ "تم کیا جانو پریم کیا ہوتا ہے اپنا تے کا رہ سعادت چولے ما ۔۔۔ اچھا تم لوگ ایک گیت اور سن لو ۔۔۔

جودی تارے مائیں چیٹی گو
تیکی آمائیں پیسے جیسے
اپنی بو لو بھا لگر دیسے
جانی لے
جانی لے

اگر ہم اُسے پہچان پائے، کیا وہ مجھے پہچان جائے گا، بے بھاگ، معلوم نہیں، کبھی کبھی اس کا گیت ختم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہاں اچانک سپرنٹنڈنٹ پہنچ جاتیں اُن کی ڈانٹ پھٹکار شروع ہونے سے پہلے ساری لڑکیاں جلدی جلدی اپنی کمروں کو کھسک لیتیں۔ پھر شامت سائی بیچارے کی آجاتی تھی لیکن وہ کسی سے شکایت کرنے کے بجائے سر جھکائے جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا تھا۔ وہاں اپنی رکشا کا تالا کھول کر اُسے آگے بڑھائے جاتا۔

سریتا کو سائی پر بہت ترس آتا تھا پتہ نہیں کیسے یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ وہ کسی بہاری دہاڑن سے عشق نہیں کرتا ہے۔ اُسے یونیورسٹی کی ہی لڑکیاں پسند ہیں جو ہر سال وہاں آتی ہیں کچھ چلی جاتی ہیں کچھ اگلے چند برسوں کے لیے رہ جاتی ہیں۔ انہیں کئی کئی سال تک اپنی رکشا پر بٹھا کر دوڑاتا رہتا ہے اُن میں کسی کے ساتھ بھی اس کا رشتہ جڑنے کا امکان نہیں ہوتا ۔۔۔ پھر بھی وہ ان سب کو من ہی من میں چاہتا رہتا ہے وہ سب مل کر ایک ہی پورے وجود کے مانند اس کے دل و دماغ میں بسی رہتی ہیں ۔۔۔ وہ اس وجود کا کوئی ایک نام بھی نہیں رکھ پاتا اس کی کوئی شکل بھی قائم نہیں کر سکتا۔ بس ایک تصور کے سہارے وہ جی رہا ہے اور اسی کو گیت سا بنا کر گاتا رہتا ہے۔

سڑک کے کنارے چلتے ہوئے سریتا نے چھوٹی چھوٹی دکانوں کی طرف دیکھا جہاں وہ اکثر آیا کرتی تھی ۔۔۔ پرووزیشن اسٹور، کلاکیندر، دستکاری بھنڈار، کیپ شاپ جس کے بوڑھے مالک سے لڑکیاں روز مرہ اور سینیٹری ٹاولز تک خرید لاتی تھیں ایک چھوٹا سا ایر کولڈ ٹی ہاؤس، چمڑے سے مڑھے ہوئے بانس

کی مصنوعی تیلیوں کے چھوٹے چھوٹے موڈھے اور ایک ماسک ہاؤس جس کے اندر مختلف حالتوں کے علاوہ درگا، راون اور کئی دیوی دیوتاؤں کے پلاسٹک کے بنے ہوئے رنگ برنگے مکھوٹے دیواروں پر اور شوکیسوں میں سجے رہتے ہیں۔ وہاں جا کر ایسا لگتا تھا ان سارے مکھوٹوں کے حقیقی کردار انہیں وہاں ڈیپارٹ کر کے کہیں چلے گئے ہوں۔ پھر کبھی نہ لوٹ آنے کے لیے۔

سر تاپا احتیاط اس دوکان کے اندر چلی گئی۔ ماسک بیچنے والی ایک سنتھالی عورت تھی۔ وہ ایک کونے کے شوکیس پر جھکی اخبار پڑھنے میں مصروف تھی۔ یہ وہی عورت تھی جو گاہکوں کی طرف اس وقت نظر اُٹھاتی تھی جب وہ اپنی پسند کا ماسک خرید کر اس سے دام پوچھتے تھے۔ اسی دکان سے آدرش اور اُس نے بھی دو ماسک خریدے تھے اور اپنے اپنے چہرے پر لگا کر خوب ہنسے تھے۔ ماسک کے پیچھے ان دونوں کی شخصیتیں بالکل چھپ گئی تھیں۔ اس نے ایک اساطیری دیوی کا ماسک سرسرے انتخاب کر لیا اور اسے دام دے کر باہر آ گئی۔

وہ ٹورسٹ لاج کو جانے والی سڑک پر مڑی تو اس کی نظر ایک بہت بڑے سائن بورڈ پر جا کر سائن بورڈ اُسے گوشت پوست کے ایک زندہ انسان کی طرح لگا۔ مسکراتا اور لاج کی اور جانے کے لیے اشارہ کرتا ہوا ـــ وہ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ جیسے اس نے اُسے پہچان لیا ہو۔

کاؤنٹر پر ایک بنگالی دادا دونوں ہتھوں میں لوشن چڑھا کر چھینک مارنے کے لیے منہ کھولے بیٹھا تھا۔ وہ کوئی نیا آدمی تھا۔ ادھر اُدھر کوئی پرانا بیرہ بھی نہیں دکھائی دیا۔ اگرچہ دو ایک نئے بیرے بڑے مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے اس کے قریب چلے آئے۔ چہرے جانے پہچانے نہ ہوں تب بھی کبھی کبھی ہنسی شک ہونے لگتا ہے، وہ جان پہچان کے ہیں۔ کوئی چہرہ ـــ کوئی ایک شاید اچانک اپنی ایسی ہی بے تحاشی میں سے نکل کر اس طرح مسکرانے لگے جس میں اس کی ساحت تمام ہو جائے۔ اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ میں اُٹھائے ماسک کی طرف دیکھا جو بہت ہی مسرور کیفیت کا حامل تھا۔

اُس نے پوچھا ـــ "اتنے حال ہو گیا؟"

پھر اُسے خود ہی ایسا لگا اُس نے یہ فرض کیوں کر لیا ہے کہ وہاں پہلے سے رکا ہوا کوئی مسافر واقعی حال کر کے چلا گیا ہو گا۔ بنگالی دادا نے سر گھما کر اپنے پیچھے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھا۔ بیشمار نمبروں پر چابیاں لٹک رہی تھیں۔ کوئی کوئی نمبر خالی بھی تھا۔

"اکھس اور دی ہائی لے آپ کو مِس کر پاسکتا سینگل ہائی؟"

ایک بیرہ دخل انداز ہو کر بولا ___ "انتیس نمبر والا بسترا ابھی نہیں آیا پر آئے گا ضرور۔" وہ مسکراتے کچھ بنگالی، کچھ ہندوستانی اور کچھ انگریزی میں سمجھایا ___ "آئی لو یو رسمی کے گیسٹ ہاؤس کو چھوڑ کر یہاں آ جاتا رہا ___ سمجھا؟ انتیس نمبر،"

"ٹھیک ہائی، ٹھیک ہائی وہ آج نہیں مل سکتا۔ ایک بستر ہر سال آج کا دن ٹھہرنے واسطے آتا ہے۔ اڈوانس میں آرڈر بھیج کر بک کرا لیتا کل مارننگ چھوڑ بھی دے گا۔ آپ کا واسطے کل واسطے بک کرے گا۔"

"اچھا کھولو تو اسے ذرا میں ایک نظر دیکھ لوں۔"

وہ بیرے کے پیچھے چپ چپ سی کاریڈور میں چل رہی ہے جو ہاتھ میں چابی اٹھائے جا رہا ہے وہ یہ جانتے ہوئے بھی ہر ایک کمرے کی چوکھٹ پر لکھے ہوئے نمبر دیکھتی جا رہی ہے چاہے تو آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتی ہے۔ اُسے معلوم ہے اُسے کہاں جانا ہے۔

وہ گردن گھما کر دھوپ میں نہلائے ہوئے لان کی طرف دیکھنے لگتی ہے کوئی غیر ملکی جسم پر صرف جیسے پیٹ کے بل لیٹا گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کی گہری گوری پیٹھ پر پڑا ہوا اخبار ہوا کے جھونکے سے اُڑ کر دور جا پڑا ہے ___ ایک گہری کین چیئر میں ڈوبی ڈوبی سی کوئی عورت اپنے تازہ دُھلے ہوئے لمبے بال پیٹھ پر بکھرائے سویٹر بننے میں مصروف ہے۔

کمرے کے اندر جاتے ہوئے اُسے ایسا لگا وہ ایک پورے مرد کی مضبوط بانہوں میں پہنچ گئی ہے جو اُسے منع کرنے پر بھی بار بار چوم رہا ہے ___ اُس کی آنکھوں پر، اس کے ہونٹوں پر اور اس کے ناک کے خوبصورت بالے پر۔ وہ بار بار گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے تو وہ اس کی گردن کی نس رگ پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اسے بالکل بے بس کر دیتا ہے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ایک ہی طرف دیکھتی رہ جاتی ہے جدھر کھلے ہوئے وارڈروب میں سے اُسے ہینگر پر لٹکی ہوئی پینٹیں اور شرٹیں دکھائی دینے لگی ہیں اور ایک اسٹول پر رکھے ہوئے سوٹ کیس پر لاپرواہی سے پھینکا ہوا رنگین تہمد اور فرش پر گرا ہوا ایک میگزین اور باتھ روم میں واش بیسن کے پائپ پر پھیلا ہوا تولیہ۔

وہ اچانک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگتی ہے۔ "میں ممی کو کیا جواب دوں گی؟ وہ

میری شکل دیکھتے ہی سمجھ جائے گی ــــ تم چلے جاؤ یہاں سے ــــ پھر کبھی مت آنا یہاں ـ"

سرتا کو اچانک ہاتھ میں اُٹھایا ہوا ماسک یاد آ جاتا ہے ــــ وہ اسے بڑی حیرت سے دیکھتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس کا کیا کرے ــــ دونوں نے اپنے اپنے چہرے پر ماسک چڑھا کر ایک کیسٹ کی دُھن پر ڈانس کیا تھا ــــ پھر اس نے اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹے لیٹے ایک گیت سنایا تھا ـ ـ ـ

بڑا لو بیتی ریبر کو تھا
بھولے گیرے ہائے ادبیتی
جو گیر دیکھا پیا پیر کا تھا
تیکی بھولا جائے

وہ بنگالی زبان نہیں سمجھتا تھا اس نے اسے ایک ایک لفظ کا مطلب بھی کہہ سنایا تھا۔

اس پیارے دل کی راحت
بھول جاؤ گے کیا؟
ہائے وہ آنکھ کا ملنا
دل کی بات ہوئی
وہ کیا بھلایا جا سکتا ہے؟

سرتا نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے چہرے پر ماسک چڑھا لیا اور کمرے کو ایک بار پھر دیکھا ادھر اُدھر گھوم کر وہ اپنا ماسک فرش پر بچھے پلنگ پر بدحال سا ہو کر جانے لے رہا تھا اس کی کمست سے مالکل بے حس ــــ اسے اچانک غصہ آ گیا ــــ اس نے پاؤں سے زور سے ٹھوکر ماری ـ اس کا قدیم مردانہ وجاہت کا ماسک دور جا پڑا میز کے پیچھے ' مالکل اُلٹا ہو کر کانپنے لگا لال چیونٹی کی طرح آسمان کی طرف ہاتھ پاؤں چلا رہا ہو ـ اس نے آگے بڑھ کر اُسے ایک ٹھوکر اور ماری پھر اُسے زور سے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا ــــ

"میم صاحب کرہ صاف کرنا ہوگا؟"

وہ جانتی ہے بیرو کمرے میں ہے جھانک کر ایسا کیوں کہہ رہا ہے ' وہ کتنی دیر تک حیرت زدہ سا اُس

کی حرکتیں دیکھ رہا ہے وہ اُسے کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل آتی ہے چہرے پر اسی طرح ماسک لگائے
ہوتے۔ وہ بھول سی گئی ہے کہ وہ ماسک لگائے ہوتے ہے اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ اسے وہاں سے چلے جانا
ہے۔ یہ کمرہ آج اُسے نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ وہ کسی ایسے آدمی کے لیے پہلے سے بُک ہے جو ہر سال اسی روز
یہاں آتا ہے۔ اُسے وہ لمبے کاریڈور کے آخری سرے پر ریسپشن روم کے سامنے ٹیکسی میں سے باہر آتا
ہوا دیکھ سکتی ہے۔ ایک بیراڈِگی میں سے اُس کا سامان باہر نکال رہا ہے وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا
کاونٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا سر بالکل سفید ہو چکا ہے۔ اس نے اسی رنگ کی ہلکی ہلکی داڑھی
بھی اُگائی ہے۔ سرِتا کو ایسا لگا جیسے کاریڈور پہلے سے بہت لمبا ہو گیا ہو وہ کتنی دیر سے چل رہی ہے
لیکن یہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا اس طرح چلتے چلتے تو کئی یُگ بیت جائیں گے وہ اپنی رفتار تیز کر دیتی
ہے پھر جیسے بھاگی سی لگتی ہے اور اس کے سامنے سے گزر کر گیٹ سے باہر نکل جاتی ہے۔

پُشپی کی ماں

ایک سے زچہ بچہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پچاس کے قریب بیڈ لگے ہوئے ہیں جن پر وہ سب عورتیں لیٹی ہوئی ہیں جن کے بچے پیدا ہو چکے ہیں، یا ہونے والے ہیں اور جگہ کی کمی کی وجہ سے فرش پر بھی بستر لگا کر عورتوں کو لٹایا ہوا ہے۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے سفید دودھی آہنی پنگوڑے کئی قطاروں میں ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں جن پر نوزائیدہ لال لال بچوں کی کلائیوں کے ساتھ اُن کی ماؤں کے رجسٹرڈ نمبر سفید کپڑوں کی پٹیوں پر لکھ کر سی دیے گئے ہیں۔ انہیں دودھ پلوانے اور کبھی کبھی بہت زیادہ رونے پر چپ کرانے کے لیے وہی نمبر دیکھ کر انہیں اُن کی ماؤں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کے رونے کا شور اس وقت بھی پورے وارڈ میں گونج رہا ہے لیکن وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایسی بھی ہے جو سب سے زیادہ شور مچانے کے لیے بدنام ہے۔ وہ نرسوں، آیاؤں، وارڈ کے اندر جھاڑو لگانے اور گیلا پوچا مارنے والوں اور ٹرالیوں پر کھانا بانٹنے کے لیے آنے والوں کے ساتھ تو جھگڑتی ہی ہے۔ اُن کے علاوہ وہ ان عورتوں کو بھی چھیڑنے سے باز نہیں آتی جو اس کے دائیں بائیں اور دور دور کے پلنگوں پر اپنے پھولے پیٹ لیے ہوئے زچگی کے انتظار میں خاموش لیٹی رہتی ہیں اور اس کے ساتھ کوئی بات ہی نہیں کرتیں، لیکن گالی دینے کی شدید خواہش اس کے اندر اس وقت بے اختیار پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ کروٹ بدل کر یا محض سر گھما کر ساتھ کے بیڈ پر پُشپی کو پڑا ہوا دیکھ لیتی ہے۔

یہ محض اتفاق ہے وہ دونوں ماں بیٹی ہیں اور ڈلیوری کے لیے ایک ہی وقت میں ہسپتال میں داخل ہوئی ہیں اور انھیں بدقسمتی سے ساتھ ہی لٹا دیا گیا ہے دونوں کے بچے دو دو روز کے وقفے کے ساتھ آگے پیچھے ہوئے ہیں لیکن پستی کی ماں کو اس بیٹی ایک آنکھ نہیں بھاتی اُسے وہ دن میں جب تک کئی درجن گالیاں نہ دے لے، اُسے چین نہیں پڑتا اُسے سب سے زیادہ غصہ اسی بات کے لیے ہے کہ اس بیس سال کی یتیم صورت دُبلی پتلی پستی ٹھیک انہی دنوں حاملہ ہو کر اسی ہسپتال میں کیوں پہنچ گئی جن دنوں وہ بھی یہاں آئی ہے اس کا پارہ اس وقت تو اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے جس وقت کوئی آیا پستی کی بھوک سے ملاتی ہوئی بچی کو پنگوڑے میں سے اٹھا کر اس کے پاس لٹاتی ہے اور وہ اپنے چہرے پر ہلکی سی سرخی پیدا کر کے اُسے اپنے آنچل میں چھپا کر دودھ پلانے لگتی ہے اس کا بس چلے تو سارے وارڈ میں لیٹی ہوئی عورتوں کی نظروں سے چھپ کر ہی اپنی لاڈلی بچی کو دودھ پلا دیا کرے ابھی تو اُسے ٹھیک طرح سے دودھ پلانا بھی نہیں آتا ایک مہربان آیا ہی نے اس کا ہسپتال سے ملا ہوا پلاسٹک اٹھا کر اُسے بچی کے منہ میں اپنی سی چھاتی ٹھونسنا سکھا دیا تھا اب وہ جب بھی ایسا کرنے لگتی ہے تو اس کی ماں کے کوسنے شروع ہو جاتے ہیں ۔۔۔ "پلا پلا اور پلا سانپنی، اسے دودھ، تیرا دودھ پی کر بھی تیری سانپنی ہی بات ہوگی، قسمت کی مار، میں نے جو سانپنی جنی تھی وہی اب میرے سامنے ایک اور سانپنی کو جن کر پال رہی ہے کمخواں غارت کرے دونوں کو ۔۔۔ میں دونوں کے مردے اسی ہسپتال سے اُٹھتے دیکھوں،
ہائے کیا زمانہ آ لگا ہے، ماں بیٹی ایک ہی وقت میں بچے دینے ہسپتال میں آ پڑی ہیں"

یہ سن کر مریضاؤں کے بیڈ ٹھیک کرتی ہوئی ایک آیا کے منہ سے ہنسی چھوٹ گئی تو اس نے کہہ دیا ۔۔۔
"یہ تو تیرے سوچنے کی بات بھی تو اس عمر میں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی" تو پستی کی ماں کی گالیوں کا رخ اس طرف مڑ گیا

"سور کی بچی، تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھنے لگے، ہماری باتوں کے بیچ تو کیوں کود پڑی، الو کی سور کی اولاد!"

آیا سے برداشت نہ ہو سکا۔ اپنے جسم پر خاکی رنگ کے لیے گاؤن میں سے جھانکتے ہوئے بھرے بھرے کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر چیخ پڑی ۔۔۔ "تو نے مجھے گالی دی ؟ تو نے مجھے سور کی اولاد کہا ؟"

"تو اور کیا کہوں ۔۔۔ الو کی پٹھی کہوں ؟ حرام زادی کہوں ؟ بتا دے جو تجھے پسند ہو وہی کہا کروں گی آئندہ۔"

دیکھ دیکھ، میں کہتی ہوں اپنی زبان کو لگام دے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا پھر مجھے گالی دی تو گُدّی سے زبان کھینچ لوں گی" ہاں، بتائے دیتی ہوں!"

"کیا بتائے دیتی ہے! تو یہاں گورنر لگی ہوئی ہے! کیا بگاڑ لے گی میرا؟ سالا تو میری نظر میں سُور کی بچی تھی ہے اور اُلّو کی پٹھی بھی اور حرامزادی بھی کیا میں تجھے جانتی نہیں ہوں!"

آپا پیر پٹختی اور روتی ہوئی شکایت کرنے وارڈ کی انچارج نرس کے پاس چلی گئی اور نرس اس کے ساتھ ساتھ نیتی کی ماں کے بیڈ کے پاس آ کر پوچھنے لگی۔ "کیا بات ہے؟ تم ہر ایک کے ساتھ کاہے کو ہر وقت جھگڑا کرتی رہتی ہو؟"

آپا روتے روتے بولی۔ "اس نے مجھے بے قصور تین گالیاں دیں پہلے سور کی بچی کہا پھر اُلّو کی پٹھی پھر حرامزادی بھی۔"

نیتی کی ماں نرس کی موجودگی سے بالکل متاثر نہ ہوئی بلکہ کسی قدر متبسم آواز میں آپا سے بولی۔ "تو سوئے مت بہا سسٹر کو سچ سچ بتا دے میں نے تجھے کیوں یہ گالیاں دی تھیں؟" پھر وہ خود نرس کی طرف متوجہ ہو کر بولی "سسٹر تم خود اس سے پوچھو نا۔ اُس نے مجھ سے کون سی بات کہی تھی، جس پر میں نے اُسے گالیاں دیں!"

نرس نے آپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "یہ اپنی بیٹی کو ملامت کر رہی تھی کہ اُس نے اُس کی یہاں موجودگی میں کیوں رجگی کرائی۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ یہ تو تیرے سوچنے کی بات تھی تو اس عمر میں کیوں ماں بنی؟ بس، یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑی!"

"تت تتا، وہ لڑکی تیری ماں لگتی ہے جو اُس کی طرف داری کرنے لگی؟ پھر میں نے پہلے تجھے ایک ہی گالی دی جس کا مجھے حق تھا اس پر تو نے اعتراض کیا تو میں نے کہا اچھا دوسری اور بھی گالیاں ہیں جو تجھے پسند ہو وہی دے دیا کروں گی"

نیتی کی ماں نے منہ پھیر کر لیٹی ہوئی اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرس سے کہا۔

"سسٹر، وہ میری اپنی جائی بیٹی ہے اس سے میں جو کچھ بھی کہوں اس میں یہ دخل دینے والی کون؟ اب آپ ہی بتاؤ سسٹر، قصور کس کا ہے میرا یا اس کا؟ اور پھر کوئی عورت صرف اپنی مرضی سے تھوڑے ہی ماں بن جاتی ہے آپ سارے وارڈ کی ایک ایک عورت سے جا کر معلوم کر سکتی ہیں۔ کون اپنی مرضی سے

ماں سے پیدا ہوئی اور کون اپنے مرد کی زبردستی کا شکار ہوئی ہے؟"

نرس اپنے اسی تحکمانہ مگر شستہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دی۔" وارڈ
میں شور مچانا منع ہے، یہاں اور بھی پیشنٹ لوگ پڑا ہے۔ سب کے آرام کا خیال رکھا کرو۔"

پشپی کی ماں نے دیکھ لیا کہ نرس دور ہیر کے سامنے جاکر بیٹھ چکی ہے، تو اس نے تین چار
بیڈ پرے پہنچ کر پلنگوں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بدلتی ہوئی اسی آیا کو مخاطب کر کے کہا۔
"بڑے رعب سے سسٹر کو بلا کر لے آئی تھی، جیسے تیرے کہنے پر وہ مجھے پھانسی ہی تو لگا دیتا
کبھی باہر مجھے دکھائی دے گئی تو سارے جوتوں کے کھوپڑی پلپلی نہ کر دوں تو میں بھی اصلی بہار نہیں۔"

آیا بھی یہ سن کر بڑبڑانے سے باز نہ رہ سکی۔ " ایسی زبان تو کوٹھے والیاں بھی نہیں بولتی
ہیں توبہ توبہ!"

ہاں، ہاں میں جانتی ہوں تو کوٹھے سے ہی اتر کر آئی ہے۔ تبھی تو اُن کے بولنے کے طور طریقے
جانتی ہے۔"

اس کے بعد آیا کام کرتی ہوئی اور دور چلی گئی تو پشپی کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرف نگاہ ڈالی جس
نے سارے ہنگامے کے دوران ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسی نے اسی کو سنانے کے لیے
کہا "سانپ کی اولاد کیسے کنڈلی مارے پڑی ہے! اری تو میری ہی جنی تھی تو ایک بار تو میری
طرف داری میں منہ سے کچھ پھوٹی ہوتی! پر اس میں کیا شک ہے اس سانپنی کو میں نے ہی تو جنم دیا
تھا۔ پورے نو مہینے کوکھ میں اٹھائے اٹھائے پھری تھی پر مجھے کیا پتہ تھا، پیدا ہو کر مجھے ہی زندگی
بھر ڈستی رہے گی۔ میں بھی کیسی جنم جلی ہوں کہ ایک ہی بار مر بھی تو نہیں جاتی!"

اگلے روز وہ پشپی کو وہ اس بات پر کوس رہی تھی کہ اس کے داماد نے وہاں آکر اس کی خیریت
کیوں نہیں پوچھی تھی۔ صرف پشپی کے پاس بیٹھ کر اپنی بچی کو کیوں گود میں لیے بیٹھا رہا تھا۔۔۔
"حرامیوں کی اولاد حرامی ہی نکلتی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا جس معصوم صورت پر رحم کھا کر اسے گھر میں جگہ
دے رہی ہوں، وہ میری ہی بیٹی کو پھسلائے گا! کسی کے منہ پر تھوڑے ہی لکھا ہوتا ہے۔ اللہ
سے وہ کتنا بڑا حرامی ہے ۔۔۔ آیا تھا بھوکوں جیسی مسکین صورت لیے ہوئے۔ یہ میرا سب
کچھ لوٹ کر لے گیا چپکے چپکے۔ کبھی شک نہ ہونے دیا۔ اللہ ہی اللہ وہ کونسا گل کھلا رہا ہے ہائے

بس نہیں چلتا' اُسے بھی دونوں کا گلا گھونٹ دوں' اور میں پہلے ہی بیمار سی ہو جاتے۔"
وہ اچانک زور زور سے رونے لگی لیکن اس سے کسی نے بھی چُپ ہو جانے کے لیے نہ کہا کون
ٹکڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالتا۔ اسی وقت کھانے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے دو باورچن آ گئیں
ایک از راہ ہمدردی کہہ بیٹھی ـــــ "اب رونا دھونا بند کر۔ اُٹھ کھانا کھا لے کہاں ہے تیری رکابی؟"
پُشپی کی ماں بھری ہی تو بیٹھی تھی ہاتھ بڑھا کر اُس نے ٹرالی کو زور سے جھٹکا دیا اور بولی ـــ
"رو رہی ہوں تو اپنے ہی کسی دُکھ سے تیرے ہوتوں سوتوں کے لیے میں نہیں کر رہی ہوں کہ تو
ان کے لیے بھی دو آنسو ٹپکا دوں۔"
جھٹکا کھا کر ٹرالی میں رکھی ہوئی سٹیل پتلی دال کی دیگچیاں چھلک چھلک گئیں اور گرم گرم دال کے
زیادہ تر چھینٹے نہ صرف اس کے بستر پر جا پڑے بلکہ اس کے سر اور ہاتھوں کو بھی جلا گئے۔ اُس پر وہ زور
سے چیخ کر اُٹھ بیٹھی۔ اسی آیا نے جو ابھی تک وارڈ میں موجود تھی، جل بھن کر کہا ـــ 'اسی کو کہتے ہیں ایسا
سو ہاتھا خود ہی بیٹھ لیا تو اپنی حرکتوں سے یوں باز نہیں آئے گی آج سپرڈنٹ سے کہہ کر تیری
چھٹی کرائے دیتی ہوں۔"

"کرا کے دکھا تو میری چھٹی ـــ کسی ریچھ کو اس طرح باہر پھینکا گیا ہے آج تک؟ یہ سرکاری ہسپتال
ہے سرکاری، سمجھی؟ وہ سپرڈنٹ تیری ماں کا یار لگتا ہے تو اُسے ابھی جا کر کہہ دے مری اس طرح چھٹی
کرکے تو دیکھے۔ وہ، زندہ رہ گئی تو اسے کچہریوں میں ایسا خوار کروں گی کہ وہ تیری ماں کے سارے
مرے بھول جائے گا۔"

اس کا شور سن کر وارڈ کی ساری نرسیں دوڑی دوڑی آ گئیں۔ انہیں دیکھ کر نہ صرف وارڈ کی
ماما آیا دونوں نے پُشپی کی ماں کی شکایتیں کیں بلکہ اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹی ہوئی کئی مریضاؤں نے بھی اُٹھ کر
پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ سب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا سب نے اسے وہاں سے کسی اور وارڈ
میں شفٹ کر دینے کی اپیل کی تھی لیکن بدقسمتی سے وہاں ایک ہی جنرل وارڈ تھا باقی آٹھ دس پرائیویٹ
روم تھے جہاں اس جیسی نادار عورت کو مفت میں رکھا نہیں جا سکتا تھا باہر برآمدے میں اس
قدر سردی تھی کہ اُسے ہوا لگ جانے کا خطرہ تھا نرسوں نے باہمی مشورہ کر کے اسے اسی وارڈ کے
ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس طرح وہ اپنی بیٹی سے بھی کافی دور ہو گئی، جسے وہ ہر وقت لاڈ حسرت

کوستی رہتی تھی۔ لیکن وارڈ کے کونے میں بھی جا کر وہ بڑبڑاتی رہی — ”کیا میں نہیں جانتی جنھوں نے میری شکایت لگائی ہے، اُن میں کس کس نے حرامی پلے جنے ہیں، لکھوانے کے لیے تو انھوں نے بڑے بڑے رئیسوں کے نام لکھواتے ہیں جو سب اُن کے قرضی شوہر ہیں!“

اسی شام کو اس کا شوہر آفس سے اور اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے آیا تو اس کا بیڈ اپنی پُرانی جگہ سے ہٹ کر پُشپی کی طرف بڑھ گیا اور اس کے سر پر پہلے بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی خیریت پوچھی پھر اپنی بیوی کے بارے میں دریافت کیا۔ خود دور کونے میں لیٹی لیٹی یہ سب دیکھ رہی تھی وہ اچانک بھڑک کر چلا اٹھی ”میری سوت کے پاس کھڑا کیوں پیار جتا رہا ہے؟ ادھر آ میرے پاس تجھے سب بتاتی ہوں۔“

تقریباً پچاس برس کا کئی ہفتوں کی بڑھی ہوئی تیوری لیے جاسے مضبوط بدن کا تیورام، توبہ توبہ کہتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور بڑے محتاط لہجے میں بولا — ”کیسی گندی بات تو نے منہ سے نکالی آج! پُشپی میری بیٹی کے برابر ہے۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے، جنھوں نے سنا ہوگا۔“

اس سے پہلے کہ وہ اسے تازہ واردات کا قصہ سناتی تیورام نے اپنی بپتا چھیڑی — ”میرے پیچھے پھر پولیس پڑ گئی ہے۔ دھوکے میں چوری کا ایک موٹر کا ایک پُرزہ خرید بیٹھا تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر مقدمہ ضرور چلائے گی۔ شاید پھر جیل کی ہوا کھانی پڑے۔ اچرجیت ملے تو اس سے کہوں، میری ضمانت کا بندوبست کردے۔“ ادھر پُشپی اپنے بیڈ پر لیٹی اپنے پتی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آفس سے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی لیکر عموماً اس وقت تک آجاتا تھا۔ اس وقت اُن کی ننھی منی سی گڑیا اپنے پنگوڑے میں خوب گہری نیند سو رہی تھی۔ جونہی وہ آجاتا تھا تو اس کی طرف بڑے پیار سے ایک نظر ڈال کر سیدھا اپنی پہلی کی کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ اُسے گود میں اُٹھا کر اس کے پاس آبیٹھتا تھا۔ وہ سوئی ہوئی ہوتی تب بھی وہ اُسے ہلا کر جگانے کی کوشش کرتا تھا۔ پُشپی اُسے منع ہی کرتی رہ جاتی — ”اُسے سونے دیجیے نا، کہتے ہیں شروع شروع میں بچے اسی طرح کئی کئی گھنٹے سوتے ہیں۔“

یہ کہتے کہتے وہ اپنے شوہر کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے بھی دیکھتی رہتی۔ یہ ننھی منی گڑیا ان دونوں کے پیار کی ہی تو نشانی ہے۔ ان لمحوں میں وہ اپنے آدمی کی قربت اور محبت میں سرشار ہو کر دن بھر کی اذیت کو بالکل بھول جاتی، جو اُسے اپنی ماں کی گالیاں سن سن کر اور اس خیال سے

تھا کہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے، محسوس ہوتی رہتی تھی۔ چرجیت نے آج آنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ اُسے وارڈ کے قریب ہر ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی مریضہ کے پاس کوئی نہ کوئی ملنے والا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے پتی کی خیریت کی بس ہی بس میں پرارتھنا کرتے وقت وہ یہ بھی یاد کر رہی تھی کہ اس کی اور چرجیت کی محبت اُن کے چھوٹے سے گھر میں کس طرح رہتے رہے اور وہاں سے چھپ چھپ کر پروان چڑھی تھی۔ وہ رہنے کے لیے ایک کرائے کے کمرے کی تلاش میں اچانک اُن کے گھر میں آ نکلا تھا۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ اُن کے یہاں ایک کمرہ خالی ہے۔ اس وقت وہ اور اُس کی ماں اپنے چھوٹے سے آنگن میں چھری سے کاٹتے ہوئے بے شمار اماری کا عد پھیلاتے ہوئے سائے میں مصروف تھیں۔ اس کی ماں اپنی عادت کے مطابق بدن پر صرف ایک ڈھیلا ڈھالا بلاؤز اور گھگھری پہنے ہوئے تھی۔ اپنے گھر کے اندر وہ سدا ایسا ہی لباس پہنا کرتی تھی اور اُس کے بلاؤز میں سے ڈھلکی ڈھلکی لٹکتی ہوئی چھاتیاں جو اکثر بلاؤز کے نیچے سے باہر نکل پڑتی تھیں اور بہت کم لمبے گھیرے میں سے صاف صاف نظر آنے والی بھری بھری سفید گوری گوری بانہیں اور پنڈلیاں دیکھ کر اُسے خود بھی شرم محسوس ہونے لگتی کہ جس طرح وہ قمیص، شلوار اور دوپٹے سے اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھتی تھی، اسی طرح اس کی ماں کیوں نہیں کرتی۔ لیکن اس کے سامنے تو وہ دم بھی نہیں مار سکتی تھی۔ جس وقت چرجیت اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، وہ تب بھی اسی حالت میں بیٹھی رہی تھی۔ اس کی طرف قصائیوں جیسی نظروں سے ٹٹولتی ہوئی پوچھتی رہی تھی

"تو کیا کرتا ہے؟"

"نہر کے محکمے میں کلرک ہوں"

"کتنی تنخواہ پاتا ہے؟"

"پونے پانچ سو"

"صبح کے گئے جاتا ہے اور شام کو لوٹتا کب ہے؟"

"یہاں رہوں گا تو صبح نو بجے کی بس پکڑ کر جایا کروں گا۔ مجھے شام کو ایک ٹیوشن بھی ملی ہوئی ہے۔ اس لیے رات کو آٹھ بجے ہی لوٹ کر آ سکوں گا"

"ٹھیک ہے۔ تب تو تم آسانی سے سو روپے کرایہ دے سکو گے۔ بجلی پانی کے لیے پندرہ روپے

الگ دیے ہوں گے اور بجلی کا بلب چالیس واٹ سے زیادہ کا نہیں لگاؤ گے اور رات کو نو بجے ہی بجلی بجھا دینی ہوگی سمجھ گیا نا۔"

"جی ہاں سمجھ گیا۔"

"صورت شکل سے تو تم شریف ہی لگتے ہو لیکن بتا دوں کہ جب اپنے کمرے میں سے نکل کر ٹٹی اور غسل خانے میں جاؤ گے تو اس آنگن میں سے سر جھکا کر نکلو گے۔ ادھر اُدھر بالکل نہیں دیکھو گے۔ سمجھ گیا نا؟"

"جی سمجھ گیا۔"

"اور ہاں، پیشگی کرایہ بھی دینا ہوگا۔ دو مہینے کا۔"

"دے دوں گا ابھی لے لیجیے۔"

اس مکان کا کرایہ وہ لوگ صرف تیس روپے دیا کرتے تھے کیونکہ وہاں بہت عرصے سے رہ رہے تھے اس معاملے میں اس کی ماں بہت چالاک نکلی پہلے جو کرایہ دار رہتا تھا اس سے پچاس ملتے تھے اب سو ملنے لگیں گے

چرنجیت نے بھی اس کی ماں پر اپنی شرافت کا ایسا اعتبار جمالیا کہ اُس نے روزانہ رات کو پشپی کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ اس کے بدلے میں اس کی ماں نے اُسے بجلی اور پانی دونوں کا خرچ معاف کر دیا لیکن پڑھانے کا وقت جو کہ رات کے ساڑھے آٹھ بجے سے دس بجے تک مقرر تھا۔ اس لیے شروع شروع میں وہ خود اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھی پھر جب اُسے پورا اطمینان ہوگیا کہ یہ لڑکا تو بالکل گوبر ہے اس نے اُن کے پاس بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے کمرے میں جا کر کھانے پکانے میں لگی رہتی تھی۔ چرنجیت واقعی بہت سیدھا لڑکا تھا۔ وقت ملنے پر وہ نہ صرف اُن کے ساتھ کھانے پکانے میں مدد کر دیتا، بلکہ صبح سویرے اُٹھ کر گلی والے منشی رام کی دودھ کی ڈیری سے اپنے اور اُن کے لیے اپنے سامنے تازہ دودھ بھی دوہوا کر لے آنے لگا تھا لیکن اُس کی ماں کی تمام تر احتیاط کے باوجود ان دونوں کے درمیان محبت نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ محبت بہتے پانی کی طرح ٹھیک اسی مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی جہاں اُسے قدرتی طور پر ٹھہرنا چاہیے تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے، کیونکہ یہ خدشہ برابر موجود تھا کہ پشپی کی ماں کے

کان اسی کی طرف لگے ہوتے ہوں گے لیکن محبت کی زبان صرف الفاظ کی محتاج نہیں ہوا کرتی اس کا اظہار آنکھوں اور کبھی کبھار انگلیوں کے آپسی لمس سے بھی ہونے لگتا تھا۔ جب انہیں یقین ہوتا کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو اُن کے ہونٹ بھی کبھی کبھی اپنی بات کہہ جاتے تھے

انہیں دنوں ایک کباڑی جس کا نام شیو رام تھا جیل میں چھ ماہ تک رہنے کے بعد چھوٹ کر آگیا تھا اس نے کسی سے چوری کا مال اونے پونے خرید لیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ وہ پشپی کے ماں باپ کے گاؤں جیون کی ملیاں کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان میں ہے اس کے باپ کی وفات کے بعد ہی اُس کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیا تھا انہیں صاف ستھرے ردی اخباروں کے بنڈل بھی لا کر دے جاتا اور جب ماں اور بیٹی مل کر ہزاروں کی تعداد میں لفافے بنا ڈالتیں تو انہیں شیو رام ہی بازار میں لے جا کر بیچ آتا تھا۔ پشپی کے باپ کا ایک چھوٹا سا لکڑی کا ٹال تھا جسے اس کے مرنے کے بعد چلانا بڑا مشکل تھا اسی لیے اُسے بیچ دیا گیا تھا۔

جب شیو رام جیل سے واپس آگیا تو اس نے پشپی کی ماں کو اونی سویٹر بننے کی ایک مشین بھی خرید کر دے دی تھی جس سے وہ مہینے میں چار ساڑھے چار سو کما بڑی آسانی سے کر لیتی تھی۔ ایسے مہربان آدمی سے چربھیت کی بھی دو چار بار ملاقات ہوئی، جو وہاں اکثر آتا جاتا تھا، لیکن یہ بات اُسے پشپی نے ہی بتا دی تھی کہ وہ دراصل اس کی ماں کو بہت چاہتا ہے اور دونوں کبھی نہ کبھی چھپ چھپ کر مل بھی لیتے ہیں۔ وہ جگہ عام طور پر شیو رام کا چھوٹا سا گھر ہی ہوتا تھا جس میں اور کوئی بھی نہیں رہتا تھا اس کی بیوی پاکستان سے آتے ہوئے راستے میں کہیں اُٹھا لی گئی تھی اور اس وقت تک اُن کے بال بچے بھی نہیں ہوتے تھے یہاں آکر اس نے کباڑ خریدنے اور بیچنے کا چھوٹا سا دھندہ شروع کر لیا تھا ایک ایسے معمولی کباڑی کو بھلا کون رشتہ دیتا جو کئی بار پکڑا جا چکا تھا۔ چربھیت کو شیو رام میں ہی امید کی ایک جھلک نظر آگئی تھی اور اس نے کمال چالاکی سے اُس کے ساتھ دوستی گانٹھ کر اُسے ایسے آفس کی ہر سال سینکڑوں من ردی خریدنے کا ٹھیکہ دلا دیا تھا لیکن اس کے لیے اُس سے کوئی رشوت لینے کے بجائے صرف یہ طے کر لیا تھا کہ وہ پشپی کی ماں کو اپنے گھر میں مستقل طور پر بسا لے اور ان دونوں کی بھی شادی کرا دے اتفاق سے یہ تیر نشانے پر جا بیٹھا اور ماں بیٹی دونوں کی شادی ایک ہی دن اسی گھر میں ہو گئی تھی۔ شیو رام پشپی کو بیاہ کر اپنے

"بی بی، ڈاکٹر نے تکلیف نہیں ہوتا۔ ان دنوں تو بالکل نہیں ہوگا۔ ابھی ابھی تمہارا بچہ ہوا ہے۔ نہ دونوں سپرنٹنڈنٹ ایک فارم پر دستخط سا دو ابھی لا دیتی ہوں۔ کل آپریشن بھی کر دیں گے۔"
نرس کو ہاتھ میں انجکشن پکڑے ہوئے دیکھ کر پیشی کی ماں نے شکایتی لہجے میں کہا "پرسسٹر تم میری ماسپہ میں بڑی بے دردی سے سوئی گھسیڑ دیتی ہو جس سے میری چیخ نکل جاتی ہے۔"
نرس نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، ایسا بالکل نہیں ہوگا تم اپنا ماتھو ادھر کرو، تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ سوئی اندر گیا"
اس روز نرس نے اُسے واقعی بڑی احتیاط سے انجکشن لگایا اور کچھ دیر تک بڑے پیار سے اس کے بازو پر اسپرٹ لگی ہوئی روئی ملتی اور مسکراتی رہی، تو پیشی کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
اس نے شیورام کا ہاتھ پکڑ کر روہانسی آواز میں کہا۔ "تم کیا کہتے ہو؟"
شیورام نے پربھیت اور پیشی کی طرف دیکھ کر کہا "سسٹر نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے ہمیں اب اپنے بچوں کے بچوں کو گود میں کھلانا چاہیے وہ بیچارے بھی ہمارے پیار کے لیے ترستے ہیں، تم نے کبھی سوچا ہے؟ اگر کہو تو تھوڑی دیر کے لیے اُن کی بچی کو اٹھا لاؤں اُسے ایک بار گود میں اٹھا کر تو دیکھو تم اس کی ماں ہو۔ سچی ماں"
وہ اُسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اس نے کچھ کہنے کے بجائے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ شیورام مسکراتا ہوا اپنے بچے کو گود میں اٹھائے اٹھائے پیشی اور پربھیت کی طرف بڑھ گیا۔

* * *

ایک اور دن کو پرنام

اُس نے کہا "چلتے ہیں" اور پلٹ کر کُرتا پہننے کے لیے مکان کے اندر چلا گیا۔

تب تک میں ایک اور تجویز تیار کر چکا تھا شاید پوربی پردیش کے آدمی کو جو اپنے مکان میں مرا پڑا تھا اس کالونی میں جاننے والے زیادہ لوگ نہ ہوں کیوں نہ چار چھ جنے اور بُلا لیے جائیں اگر مرحوم کی کچھ تو عزت رہ جائے۔

اُس نے بھی میری تجویز کے ساتھ فوراً اتفاق کر لیا اور اپنے لڑکے کو دوڑا کر سمتی کے سکریٹری مادھن اور دوسرے عہدیداران کو اطلاع کروا دی اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ آنے میں دیر ہرگز نہ کریں۔ سمتی کا پردھان وہ خود تھا۔

جب ہم اس مکان کے سامنے پہونچے تو چار پانچ لوگ چپ چاپ اِدھر اُدھر کھڑے تھے اندر فرش پر سفید چادر سے ڈھکی لاش کے ارد گرد چند ہی عورتیں بیٹھی تھیں اور صرف ایک عورت کے منھ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بے اختیار سسکی نکل جاتی تھی وہ اُس کی بہو تھی جس نے مرحوم کی مرتے دم تک بہت سیوا کی تھی باقی عورتیں پڑوسن تھیں۔

جس وقت اُس کے بیٹوں کے کہنے والا دوست ٹرک لے کر آیا تو اس خاموش ماحول میں جان سی پڑ گئی ارتھی کا سارا سامان اسی ٹرک میں سے لے آیا گیا تھا سب لوگ ارتھی سجانے میں

ہٹ گئے

ایک آدمی آنسوؤں کی پھیپھوں پر پھوس پھاتے ہوئے بولا " دن کا وقت ہوتا تو بوڑھے کے ساتھ میڈاما بھی جاتا۔"

"وہ اسّی سال کا ضرور ہوگا۔"

"نہیں شاید نوّے سے اوپر ہی رہا ہوگا۔"

"آج صبح تک وہ مارننگ واک کرنے جا رہا۔ میرے ساتھ علیک سلیک ہمیشہ صبح سویرے سڑک پر ہی پر ہوتی تھی۔"

"بوڑھے ٹھنٹھ پیڑ کا کیا بھروسا۔ کس وقت ہوا کا تیز جھونکا لگے اور وہ دھم سے گر پڑے۔"

"وہ بھی تو دھم سے گرا اور پر دھاں ہی۔ نہ کھانسی نہ بخار، نہ دوا نہ دارو، بس لیٹے لیٹے ہی چل دیا۔"

"کہتے ہیں اس نے اپنی بہو سے چائے لے آنے کے لیے کہا تھا۔ اسی وقت اخبار والا اخبار پھینک کر آگے نکل گیا۔ اس کی بہو نے اخبار اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور رسوئی میں چلی گئی۔ چائے کی پیالی بیچارے کے ہاتھ میں رہ گئی۔ چائے لے کر لوٹی تو وہ اخبار میں منھ چھپائے ابدی نیند سو رہا تھا۔"

"ہارٹ اٹیک والی موت بہت اچھی ہوتی ہے گپتا جی! آدمی اسپتالوں کے چکّر لگانے سے بچ جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہے ہمارے پڑوسی کی ماں جب سخت بیمار پڑی تو اس زمانے میں بس والے ہڑتال پر تھے۔ کہیں پیدل چلتے ہیں کہیں رکشہ یا ریڑھا لے کر کسی طرح گرتے پڑتے اسپتال پہنچ جاتے تھے۔ اُف! کیا پریشانی تھی۔"

"ارتھی اٹھاؤ" اندر سے کسی کی آواز سنائی دی اور رات کے بارہ بجے خاموش اور نیم اندھیرے میں ڈوبی ہوئی گلی میں اچانک "ہری بول، بول ہری" کی آوازیں گونجنے لگیں جو مجھے حد سے زیادہ پراسرار لگیں۔

آدمی خلافِ توقع زیادہ آگئے تھے لیکن سب ٹرک کے اندر ادھر ادھر کھڑے ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ بیچ میں ارتھی دھری گئی۔ ٹرک حسبِ معمول گھڑگھڑاتا ہوا چل پڑا۔ اس کی گھڑگھڑاہٹ میں کسی قسم کی اداسی یا ہمدردی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ کچھ دیر تک فاصلہ بڑی خاموشی سے طے کیا

گیا۔ لوگ گلیوں اور سڑکوں کے موڑ پر سے ٹرک کے گذرتے وقت گھبرا کر ایک دوسرے کو تھام لیتے تھے۔ جب وہ سیدھی ہموار سڑک پر پہنچ کر ایک متوازن چال سے دوڑنے لگا تو ایک آدمی اچانک بولا
"کل مکینک مستری کا معاشرہ بہت رودار تھا"
"ہاں اس نے دعوے تو بہت سے کیے ہیں"
"وہ دعدہ ہی کیا جو ایفا ہو گیا" صرف ایک آدمی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔
"اس جگہ پچھلے منگل کو میں لٹتے لٹتے بچا تھا۔"
"کیا ہوا تھا؟" بہت دور سے جیسے کسی نے پوچھا۔ اور پھر وہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا بات سنانے والے نے بھی سگریٹ پینے کی اچھا پرکٹ کی اور اُسے سگریٹ دستیاب ہو گئی تو بولا
"میں رات کو ڈیڑھ کے قریب رکشہ سے لوٹ رہا تھا شاید دو موٹر سائیکل والے گومتی کے پل پر سے ہی میرا پیچھا کر رہے تھے وہ ایک بار آگے نکل گئے۔ پھر پلٹ گئے اور پھر واپس آتے ہوئے دکھائی دیے تو رکشا والے نے ہی مجھے خطرے کا احساس کراتے ہوئے کہا"۔ کوئی گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے بابوجی"
"اچھا تو پھر!"
"پھر یہ ہوا کہ میں نے ہمت تھوڑی تروع کی سوچ بھی لیا کہ ایسی حالت میں کیا کیا ہو سکتا ہے اگرچہ میرے پاس دس پندرہ روپے سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ صرف ایسی گھڑی البتہ تھی جو ان کے لیے مالِ غنیمت ہو سکتی تھی لیکن بدمعاش لوگ تو کچھ پانے سے پہلے دو چار تگڑے تگڑے ہاتھ مار دیتے ہیں تاکہ آدمی اچانک حملہ سے گھبرا کر ہاتھ پاؤں چھوڑ دے"
"آپ نے کسی کو مدد کے لیے پکار لیا ہوتا۔"
"کوئی نہیں تھا بھائی دُور دُور تک۔ آس پاس کے مکانوں اور جھونپڑیوں والے تک پڑے سو رہے تھے۔ اور کون سنتا ہے کسی کی چیخ و پکار۔ سب ہی اپنی اپنی جان بچانے کے لیے دم سادھے پڑے رہ جاتے ہیں"
"ہاں اب تو انسانی ہمدردی نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہ گئی پھر کیا ہوا؟"
"پھر میں ایک گلی میں رکشا کو گھما کر اُتر گیا جلدی سے رکشا والے کو مزدوری دی باقی پچاس پیسے بھی واپس نہ لیے اور اُس سے کہا "تم سے وہ پوچھیں تو کہہ دینا" بابوجی کو یہیں تک جانا تھا" وہ

سامنے والے مکانوں میں چلے گئے ہیں اور میں کئی گلیوں میں سے ہوتا ہوا اور من ہی من ری سوت پتا پہنچ
نکٹ نہیں آدے۔ بہادر حب نام سادے' کا جاپ کرتا ہوا خیریت سے اپنے گھر پہنچ گیا۔"

شمشان گھومی تک پہنچنے میں ہمیں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہاں سب لوگ پھر گہری
خاموشی میں ڈوب گئے اور ایک دوسرے میں گھس گھس کر چلنے لگے

آس پاس کئی سمادھیاں تھیں کچھ قبریں بھی اور ندی کے کنارے تین چار چتاؤں میں انگارے
دہک رہے تھے کہیں کہیں راکھ کے ڈھیر لگے تھے سب صاف دکھائی دے رہا تھا جتنا کچھ آس پاس
تھا

"یہ اچھا ہوا کہ شمشان کمیٹی نے یہاں روشنی کا انتظام کر رکھا ہے"

"لیکن رات کے وقت ارتھی جلانے کا ہماری طرف رواج نہیں ہے۔"

"کسی کسی کا ہوتا ہے وہ لوگ آدمی کے مرتے ہی اسے گھر سے نکال دینے کی تیاری میں
لگ جاتے ہیں"

"اپنے گھر میں کس نے مردہ کو روکا ہے چلو ایک ایک لکڑی اُٹھا کر اپنے کا پُن کماؤ"

"ہم لوگ ایک اونچا چبوترہ تلاش کر کے ساتھ ساتھ بیٹھ گئے باقی کچھ لوگ ذرا فاصلے پر کھڑے
چتا تیار کر رہے تھے۔ شمشان کے رکھوالے بھی اُن کی مدد کر رہے تھے کہیں کہیں آوارہ کتے بھی گھومتے
ہوئے نظر آ رہے تھے جنہیں پہلے تو ہم سیار سمجھے تھے۔

میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا ــــ "یہاں میں نہ جانے کتنی بار آ چکا ہوں کتنے
لوگوں کو کندھا دیا سب یاد آ رہا ہے وہاں ایک جرنلسٹ کی لاش پھونکی گئی تھی جس کے ساتھ میرا
کافی ہاؤس میں بہت اُٹھنا بیٹھنا تھا اور وہاں ایک اور جرنلسٹ کی لاش کے ساتھ جو انگریزی اخبار سے
وابستہ تھا اور وہاں ہمارے شہر کے سب سے بڑے لیکھک کی چتا جلی تھی، جس نے مرنے سے پہلے ہی
وصیت کر دی تھی کہ میرے مرنے کے بعد کوئی مذہبی رسم نہ ادا کی جائے۔"

"وہ تو کمیونسٹ تھا۔"

"ہاں اُس نے اپنی کہانیوں میں مذہب کے ٹھیکیداروں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا"
چتا کو آگ دے دی گئی تو ہم سمجھے ابھی واپس بھی ہو لیں گے اور وہ رات ہم جلتی رہے گی جس طرح

اور چتائیں جل رہی تھیں لیکن کسی نے آکر بس جھڑ دی۔ یہاں کم سے کم چار گھنٹے ضرور لگیں گے جب تک چتا پوری طرح بھسم نہیں ہو جاتی۔ ان لوگوں کے یہاں چتا کی جگہ کو دھو دھا کر واپس جانے کا رواج ہے۔"

سب نے جیسے تیر مار کی طرح اس مسئلہ کو پی لیا اور بڑی خاموشی سے آسمان کی جانب لپکتے ہوئے لال لال شعلوں کو دیکھنے لگے۔

پھر اچانک کسی نے جے پرکاش نارائن کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک شخص ان سے اپنی دیرینہ ملاقاتوں کی روئیداد بیان کر رہے تھے۔ لوگ اب چتا کے پاس سے ہٹ کر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہے تھے پچھلی بارش میں کنکریٹ کا چبوترہ ایک طرف کو جھک گیا تھا لیکن اس پر دو بنچ ابھی تک موجود تھے۔ ایک ایک کر کے وہ کھنڈر سے کود گئے اور بنچوں پر جا بیٹھے۔ دو آدمی ایسے گمچھے بچھا کر فرش پر لیٹ گئے ہمارے چبوترہ پر بھی دو آدمی باتیں سنتے سنتے خراٹے لینے لگے تھے جنہیں نیند آرہی تھی۔ وہ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔

"راستے میں آپ نے مکھیہ منتری کے بھاشن کا ذکر کیا تھا کہ بہت زوردار تھا۔"

"ہاں میں کہنا یہ چاہتا تھا۔"

پہلے میری بات سن لیجیے بابو جی انقلاب ہمارے یہاں ایک نعرہ محض ہے ہونا ہوانا کچھ نہیں آپ دیکھ لیجیے گا۔"

"دیکھ کیا لیجیے گا، وہ تو ابھی سے دیکھ رہے ہیں۔"

"رات کو مہنگائی الاؤنس کی ایک اور بھی قسط دینے کا اعلان ہوا تھا۔"

"چلیے اس خبر سے تھوڑی سی مہنگائی اور بڑھ جائے گی۔" جو لوگ بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے زور سے ہنس پڑے۔ اتنے زور سے کہ ہنسی کی آواز سناٹے میں گونج گونج گئی۔

"کسی کے پاس سگریٹ ہے؟"

"شاید کامتا سنگھ کے پاس ہو لیکن وہ تو پڑا سو رہا ہے۔"

"جگا دو اُسے۔"

"ٹھہریے میں اس کی جیب کی تلاشی لیتا ہوں"

ڑی کامیابی سے سگریٹ کی وہ ڈبیا نکال لایا اور کامتا پڑا سوتا رہا

"انسان کو سولی پر بھی نیند آجاتی ہے"

"اس ماحول میں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونے کا بڑا سہارا ہے۔ ورنہ اکیلا آدمی تو سہم کر مرجائے"

"ہاں باہر کا آدمی اگر تنہا آئے گا تو ضرور گھبرا جائے گا جو لوگ یہاں کام کرتے ہیں انہیں اور ڈر اور خوف نہیں محسوس ہوتا؟"

"ہماری زبان میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہو چکے ہیں"

"سرکار نے اُردو کا آرڈیننس جاری کر کے ایک اور مسئلے کو جنم دے دیا ہے"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل چیز تاریکی شعور ہے جس سے ہمیں بے خبر نہیں ہونا چاہیئے ماضی نے ہمیں جتنا کچھ دیا ہے اُسے لیکر ہی آگے چلنا ہے۔ جہاں تک اُٹھائے اُٹھائے چل سکیں گے"

"شاید چتا جل چکی وہ لوگ پانی بھر بھر کر لا رہے ہیں"

ندی کی طرف ڈھلان والی زمین پر ہزاروں چھوٹے بڑے انگارے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے چلے گئے صرف اُن کے بھسم ہونے کی آواز ہی ہمارے کانوں میں گونجتی رہی۔ جیسے ساری کائنات اچانک بھسم ہو رہی ہو۔

"وہ مارننگ واک پر جانے کا بڑا پابند تھا میری اس کے ساتھ علیک سلیک ہمیشہ سڑک پر ہو جاتی تھی۔ صبح سویرے" اس نے اپنی بات کئی گھنٹوں کے بعد دہرائی۔

اس وقت پورب میں آسمان پر اودی سی لالی پھوٹ رہی تھی اور کچھ لوگ ہاتھ جوڑ کر پرنام کر رہے تھے شروع ہونے والے نئے دن کو۔

"آج مجھے ترقی کے لیے ایسے باس کے پاس ایک سفارش لے کر جانا ہے"

"ہی آپ کو ایک شعر سناؤں اتنی سہانی صبح دیکھ کر یاد آ گیا لیکن پہلا مصرع بھول ہی گیا جیوں جیوں دوسرا مصرع ہی سنا لیجیے۔

اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی،

"آپ نے جوش کا نام سنا ہوگا"

اور چتائیں جل رہی تھیں لیکن کسی نے آگ کم نہیں کر دی۔ یہاں کم سے کم چار گھنٹے ضرور لگیں گے جب تک چتا پوری طرح بھسم نہیں ہو جاتی۔ ان لوگوں کے یہاں چتا کی جگہ کو دھو دھا کر واپس جانے کا رواج ہے۔"

سب نے جیسے تیر ماروں کی طرح اس فیصلہ کو پی لیا اور بڑی خاموشی سے آسمان کی جانب لپکتے ہوئے لال لال شعلوں کو دیکھنے لگے۔

پھر اچانک کسی نے جے پرکاش نارائن کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک شخص اُن سے اپنی دیرینہ ملاقاتوں کی روئیداد بیان کر رہے تھے۔ لوگ اب چتا کے پاس سے ہٹ کر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہے تھے پچھلی ہاڑہ میں کنکریٹ کا چبوترہ ایک طرف کو جھک گیا تھا لیکن اس پر دو بچے ابھی تک موجود تھے۔ ایک ایک کر کے وہ کھنڈر سے کود گئے اور بچوں پر جا بیٹھے۔ دو آدمی ایسے تھے بچا کر فرش پر لیٹ گئے ہمارے چبوترہ پر بھی دو آدمی باتیں سنتے سنتے خراٹے لینے لگے تھے جنہیں نیند آ رہی تھی۔ وہ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔

"راستے میں آپ نے سکینہ مستری کے معاش کا ذکر کیا تھا کہ بہت زور دار تھا۔"

"ہاں میں کہنا یہ چاہتا تھا"

پہلے میری بات سُن لیجیے۔ ماوجی استقلال ہمارے یہاں ایک مرہ مخصوص ہے جو ماہوا نا پکھ نہیں آپ دیکھ لیجیے گا۔"

"دیکھ کیا لیجیے گا، وہ تو ابھی سے دیکھ رہے ہیں۔"

"رات کو مہنگائی الاؤنس کی ایک اور بھی قسط دینے کا اعلان ہوا تھا۔"

"چلیے اس طرح سے تھوڑی سی مہنگائی اور رہ جائے گی۔" جو لوگ بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے زور سے ہنس پڑے۔ اتنے زور سے کہ ہنسی کی آواز سناٹے میں گونج گونج گئی۔

"کسی کے پاس سگریٹ ہے؟"

"شاید کاشتا سنگھ کے پاس ہو لیکن وہ تو پڑا سو رہا ہے۔"

"جگا دو اُسے۔"

"ٹھہریے میں اس کی جیب کی تلاشی لیتا ہوں۔"

ایک بدن شہر جیسا

۲۱ دسمبر کو پرنسپل کھوٹانی اور اس کی بیوی شوبھا کی شادی کی چالیسویں سالگرہ تھی میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں کسی قسم کی بھیڑ بھاڑ نہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ باہر صرف انہی کی کریم کلر فیئٹ موجود تھی جب کہ ایسے موقعہ پر کئی کاریں اور اسکوٹر نظر آنے چاہئیں تھے۔ کھوٹانی اپنے اسٹڈی روم میں اکیلا بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہ رَم ہی پینے کا عادی تھا اور اس وقت بھی اس کے سامنے رَم کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ شوبھا کھوٹانی کچن میں تھی جس کی ایک جھلک میں نے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ ادھیڑ اور دُبلی پتلی سی عورت۔ اس گھر کی تنہائی سے میں پہلے سے واقف تھا۔ اس کے سارے لڑکے اور لڑکیاں مدت ہوئی شادی بیاہ کر کے مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں رہ رہے تھے۔ لیکن شادی کی سالگرہ کے دن بھی وہاں سناٹا دیکھ کر مجھے خیال گزرا شاید آج کی دعوت ملتوی کی گئی ہے۔ میں نے کھوٹانی سے اس قدر خاموشی کا سبب پوچھا تو وہ الماری سے میرے لئے وہسکی نکال کر لاتے ہوئے بولا۔ "آج کے دن میں صرف ایک دوست کو انوائٹ کرتا ہوں۔ یہ میرا برسوں کا دستور ہے۔ اتفاق سے آج تمہاری باری آ گئی ہے۔"

پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور ہنسی کے ساتھ اس کا تھل تھل بھاری جسم بھی ہلنے لگا۔ "لیکن یار، آج میں یہ دن ایک ایسی محبوبہ کی یاد میں بھی منا رہا ہوں جس سے اب میں قطع تعلق کر چکا ہوں۔"

میں اس سے عمر میں بیس سال کے قریب چھوٹا تھا۔ پھر بھی وہ بڑی بے تکلفی سے مجھے یار کہہ کر مخاطب کر لیا کرتا تھا جس سے اس کے اندر ہمیشہ جوان رہنے کی خواہش کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک تعلیمی ادارے کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی بے حد خوش مزاج اور اوباش واقع ہوا تھا لیکن اس کے معاشقوں کے قصے سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں تھے وہ میرے ہاتھ میں گلاس دے کر اپنی اس محبوبہ کے بارے میں بتانے لگا جس کی جدائی کا دن منانے کا بھی اس نے میرے سامنے اعتراف کر لیا تھا۔
"تم اسے نہیں جانتے۔ میں نے بھی اس سے پہلے جان بوجھ کر تمہارے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل میرے ہی کالج کی ایک نوعمر اسٹوڈنٹ تھی بس اتفاق سے ہمارا پیار ہو گیا۔ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ پیار کی کوئی عمر نہیں ہوتی ہے تم سمجھتے ہو نا تم تو بڑے رئیلسٹک انسان ہو لیکن اب میرے لئے اس کا ساتھ نبھانا مشکل ہو گیا۔ میری عمر بھی تو دیکھو یار بہت تھک گیا ہوں۔ سمجھے نا!"

وہ پھر زور سے ہنس پڑا۔ اتنے زور سے کہ کھڑکی کے باہر بجلی کے تار پر بیٹھی ہوئی ایک تنہا چڑیا گھبرا کر پھر سے اڑ گئی۔ پھر وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بڑی رازداری سے بولا۔
"لیکن وہ تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ تمہارے کئی ڈرامے دیکھ چکی ہے اور اس بات کے باوجود کہ میں اسے اب نہیں ملتا اس کا ابھی فون ضرور آئے گا وہ بڑی رنگ کال کر کے آج کے روز مبارک باد دینا کبھی نہیں بھولتی۔"
اچانک شوبھا کھوٹانی نے ہمارے کمرے میں آ کر کہا۔ "میں آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ تھوڑی دیر کے لئے مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ گھنٹے بھر تک لوٹ کر کھانا کھلاؤں گی۔ تب تک شغل جاری رکھئے۔"
اپنی بیوی کے چلے جانے کے بعد کھوٹانی نے دو پیگ جلدی جلدی اور لے لئے میں تو ابھی تک وہی پہلا پیگ لئے بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح سے تماشا دیکھتا تھا اور میں اسی طرح ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پیگوں پر قناعت کر لیا کرتا تھا اور اس کی باتیں سنا کرتا تھا۔ وہ دراصل میرے پروڈیوس کئے ہوئے ڈراموں کا ایک دیرینہ سرپرست تھا اُن کی

آدھی سیٹوں کے ٹکٹ ہمیشہ اسی کی وساطت سے بک ہوا کرتے تھے اور وہ میرے ڈرامے
کی پبلسٹی کے زور اپنے کئی دوستوں کے ذریعے پلایا کرتا تھا۔ دوستوں کو پلانا اس
کی ہابی تھی۔ شاید میری سرپرستی بھی وہ اسی نقطۂ نظر سے کرتا تھا۔

اس کی توقع کے مطابق ہمارے ہاں وہاں بیٹھے بیٹھے ناگپور سے ٹرنک کال آگئی۔
اسی لڑکی کی۔ جس نے اسے شادی کی چالیسویں سالگرہ کی مبارکباد دی اور بھوٹانی نے
اس کا بڑی خوش دلی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس کی جدائی کو بھولنے
کے لئے چھ پیگ پی چکا ہے۔ پھر اس نے اس لڑکی کی صحت، تعلیمی پروگریس اور نئی ہوائی
مشغولیات کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد اسے یہ کہہ کر چونکا دیا۔ لو اپنے محبوب ڈائریکٹر
کے ساتھ بھی آج بات کر لو جس کی تم بڑی فین ہو اُن کے ڈراموں کی تم ہمیشہ بے حد تعریف کرتی ہو۔
وہ اس وقت اتفاق سے میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔"

یہ کہہ کر بھوٹانی نے ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا اور میرے خالی گلاس میں ایک اور پیگ انڈیل کر
کچن کی طرف چل دیا۔

سمرتی جندل نے میرے دو ڈراموں کی بہت تعریف کی جو دو سال پہلے میں نے سرستی بھون میں پیش کیے
تھے۔ اُس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ کبھی وہ بھی میرے کسی ڈرامے میں کام کرنے کا موقعہ حاصل کر سکے۔ میں نے
تو اُس کی آواز سنتے ہی یہ احساس کر لیا کہ وہ ایک ایسی آواز ہے جسے سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔
جب تک وہ بولتی رہی میرے ذہن میں ایک بہت ہی حسین و جمیل اونچے قد کی تعلیم یافتہ بالغ لڑکی کا امیج
بنتا چلا گیا۔ ایک تجربہ کار پروڈیوسر کی حیثیت سے میں نے اس لڑکی اور اُس کی حیرت ناک آواز کو ذہن میں رکھ کر
خود ایک نئے ڈرامے کی روپ ریکھا تیار کر لی اور میرا اس طرح سے سوچنے کا عمل ویسا ہی تھا جیسے کوئی بے چین
عورت اپنے محبوب کے ملنے کے تصور سے ہی اپنے گربھ میں اس کا بیج قبول کرنے کے لیے تیار ہو اُٹھے۔

جب میں نے ریسیور چھوڑا تو اسی وقت بھوٹانی ایک ہاتھ میں تازہ بھُنے ہوئے اور خوشبو دیتے ہوئے
گوشت کی پلیٹ اُٹھائے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ایک بوٹی کو نوچتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اُس
نے میرے چہرے پر ہویدا جذبات کو ایک ہی لمحے میں اپنی تجربہ کار نظروں سے بھانپ لیا اور پلیٹ میرے
سامنے رکھ کر بولا۔ "سمرتی مجھ سے کہیں زیادہ ذہین بھی ثابت ہو رہی تھی جہاں تک آرٹ اور اُس کی تنقید

کا تعلق ہے اُس کی ذہنی تسکین کے لیے تمہیں ہی اس کا سرپرست بن جانا چاہیے کیونکہ اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تم ہی ایکسپلائٹ کر سکتے ہو اور ـــــ"

پھر وہ کچھ رُک کر لیکن کسی قدر اُداس لہجے میں بولا ـــ "تم اگر اس کے ساتھ عشق بھی کرنے لگو گے تو مجھے کسی قسم کا دُکھ یا حسد ہرگز نہیں ہوگا"

اُس کے بعد اس نے مجھے سمرتی جندل کا پتہ بھی لکھ کر دے دیا یہ کہتے ہوئے "جب بھی موقعہ ملے اُسے بلا لیا کرو یا کبھی خود اس سے ملنے کے لیے ناگپور چلے جایا کرو۔ تمہاری مدد سے وہ اگر شہرت کی منزلوں پر پہنچ گئی تو میں خود کو معاف کر دینے کے قابل ہو جاؤں گا کہ میں نے اتنے عرصہ تک اُسے صرف اپنی قید میں کیوں رکھا ہے"

اس واقعہ کے دو تین سال بعد اچانک میں نے کسی سے کافی ہاؤس میں قصّہ سنا کہ سمرتی جندل نام کی ایک اینگلو انڈین لڑکی کو باغی نسل کا کوئی سا ادیب اپنے ساتھ ساتھ لے گھومتا رہتا ہے دونوں نا شادی کئے ایک فلیٹ میں رہنے لگے ہیں جن لوگوں نے اس اسکینڈل میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی تھی اُن میں زیادہ تر دوسرے درجے کے کم تنخواہ پانے والے مقامی جرنلسٹ، ناکام فوٹوگرافر اور ڈراما اسٹیج پر چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے والے اداکار ہی شامل تھے۔ وہ سب اس ادیب کے اس لیے اچانک مخالف بن گئے تھے کہ وہ اپنی قصوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے روند ڈالنے کا عادی تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ سمرتی جندل کی وابستگی کی خبر نے مجھے بھی اتنا صدمہ ضرور پہنچایا کہ میں نے راگھو سوبانی کی سفارش کے باوجود آج تک اُسے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ ایک بار کسی ضروری کام سے میں ناگپور گیا بھی تو اُس سے ملنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ شاید میں اس بات کا منتظر رہا تھا کہ وہ خود ہی کبھی آکر مجھ سے ملے گی۔ اب جبکہ وہ ایک غیر معروف ادیب کی داشتہ بن جانے کی وجہ سے بدنام کی جا رہی تھی میرے اندر اُسے تلاش کرنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو سکی میں دراصل اُس کے طریق زندگی میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا جس راستے پر وہ چل رہی تھی اس کے لیے اُسے پورا اختیار تھا۔

پھر دس سال کی طویل مدت کے بعد وہ ایک روز اچانک میرے ایک ڈرامے کی ریہرسل میں پہنچ گئی جب تک یہ ریہرسل چلتی رہی میں نے اُسے نہیں دیکھا اسٹیج کے سامنے میرے آرٹسٹوں کے کتنے دوست، جان پہچان والے اور کئی سمندھی تک سو پچاس کی تعداد میں موجود تھے سمرتی بھی ان ہی لوگوں

میں آگے پیچھے کی کسی کرسی پر بیٹھی رہی ہوگی جب ریہرسل ختم ہوگئی تو وہ اچانک بھیڑ کو چیر کر میرے پاس
چلی آئی اور اپنا تعارف راگھو موہانی کے حوالے سے کرایا جسے انتقال کیے ہوئے بھی اب پانچ سال کا عرصہ ہوچکا
تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونک اُٹھا۔ پہلے تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس کی بے حد دلکش آواز میں نے بہت
عرصہ پہلے ایک بار حوض پرسی کی تھی اور میں نے انہی لمحوں میں آناً فاناً اس کے بارے میں ایک ڈرامہ کا خاکہ بھی اپنے
ذہن میں تیار کر لیا تھا اب وہ بہ نفس نفیس میرے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن وہ میرے تصور کے مطابق اتنی لمبی نہیں
تھی۔ وہ بمشکل پانچ فٹ کی ایک انتہائی دُبلی پتلی عورت تھی۔ تیس بتیس برس کی اور اسے نوکیلی پیلیوں کا
ڈھانچہ ہی کہا جاسکتا تھا لیکن خوبصورت اور دلکش۔ اس کے جسمانی اعضاء میں ایک حیرت ناک مناسبت تھی۔
اور اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ حیرت اور مسرت کا ایک دل فریب امتزاج دکھائی دے رہا تھا اور اس
کے سستول ہونٹ لفظوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روک رہے تھے اور اس کے گلے بھورے بال جو اس کے کاندھوں
پر بکھرے ہوئے تھے پیڈسٹل فین کی تیز ہوا سے بے اختیار اُڑ رہے تھے۔ جنہیں وہ ایک بچی کی سی معصومیت کے
ساتھ دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر پھر سے کانوں کے نیچے جما دیتی تھی۔

میں پہلی نظر میں کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوجانے کا کبھی قائل نہیں ہوسکا ہوں۔ اگر کوئی لڑکی واقعی
دلکش ہو تو مرعوب ضرور ہوجاتا ہوں۔ عشق تو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی کشش کو رفتہ رفتہ ہی قبول کرنے
کا ایک نفسیاتی عمل ہوتا ہے لیکن اُسے دیکھتے ہی میں نے محسوس کرلیا کہ میں اس کے ماضی کے سارے اسکینڈلز
کے باوجود اسے قبول کرسکتا ہوں اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ اگرچہ میرے اپنے آرٹسٹوں اور مداحوں
کے حلقے میں انتہائی خوبصورت اور جنسی طور پر بھوکی لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایک مبہم سے اشارے سے وہ
قریب آجاتی تھیں اور پھر میں انہیں بڑی چالاکی سے دور بھی کردیتا تھا۔ ایسا کرنا میرے لیے مشکل بات
نہیں ہوا کرتا۔ لڑکیاں اپنی اپنی غرض سے میرے قریب آجاتی تھیں ـــــ کچھ تو اسی گلیمر کی وجہ سے جو ہر
کامیاب آدمی کو ایک ہیرو کا درجہ دے دیتا ہے اور کچھ لڑکیاں اپنی جنسی پیاس ہی بجھانے کی متمنی ہوتی ہیں تو
اس چکر میں اپنا جسم تک میرے جیسے لوگوں کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ سمرتی بھی اس نئی مخلوق
اور پیاس کی سیرابی کے لیے ایک مدت سے بھٹک رہی تھی اور شاید میں غیر شعوری طور پر اس کا انتظار کر رہا
تھا۔ اب وہ اپنے آپ آنکلی تھی۔ مجھ ہی کو ڈھونڈتی ہوئی جس کا اظہار اس نے بڑی دلیری اور بے تکلفی سے
کردیا اور ہم سب لوگوں سے الگ ہوکر سنٹرل لائبریری کے منی آڈیٹوریم سے نکل گئے۔ اُسی ہوٹل کے

کرے میں چلے گئے جہاں اس کا قیام تھا اب وہ شادی شدہ تھی مغربی جرمنی کے ایک شہر میں وہ اپنے آرچی ٹیکٹ شوہر کے ساتھ رہی تھی اس نے مجھے کاؤنو گیلکر کے کچھ کلرڈ فوٹو بھی دکھائے اور مجھے بتایا کہ وہ چند روز کے بعد واپس جا رہی ہے۔

ہماری باتیں بیئر، سگریٹوں کے دھوئیں اور تیز مسالوں والے کھانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں جو ہندوستان اور یورپ کے جدید ڈراموں سے ہی متعلق تھیں اسے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اُسے ابھی تک جرمنی کے چند ایک ہی ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کا موقعہ مل سکا تھا کیونکہ وہاں ایک ہندوستانی کلاکار کے لیے کام کرنے کے زیادہ مواقع نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس نے ایک صوبائی اخبار میں ڈراموں پر ریویو لکھ کر چھپوائے بھی لیے تھے تو اس کام سے اس کو پورا اطمینان نہیں مل سکا تھا وہ چاہتی تھی کہ آزادی کے باوجود دنیا کے ایسے بڑے شہروں میں گھومتی پھرے جہاں باقاعدگی سے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں لیکن اس کی شادی اس کے لیے ایک بہت بڑی رکاوٹ بن چکی تھی۔

وہ میرے ایک مرحوم دوست کی محبوبہ رہ چکی تھی لیکن میں اپنے دوست کی خواہش کے باوجود شروع سے دوستی کی توقعات نہیں کر سکا تھا اور یہ سارا عرصہ اس نے جگہ جگہ بھٹکتے ہوئے گزار دیا تھا میں نے سوچا وہ مجھ سے دور رہ کر بھی ذہنی طور پر تو قریب ہی رہی ہے شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اور وہ ابھی تک خواہش مند نظر آتی تھی کہ میں اُسے اسٹیج پر آنے کی آرزو دوں تو وہ کافی مدت تک جرمنی لوٹنے کا پروگرام ملتوی کر دیگی اس نے میرے کہنے پر دو تین سچویشن کے ڈائیلاگ سنائے ڈائیلاگ کی ادائیگی کے وقت اُس کی آواز میں وہی گہرائی اور ویسا ہی لوچ پیدا ہو گیا جس کی گونج دس سال سے میرے کانوں میں موجود تھی جب اُس نے میرے ساتھ صرف ایک بار ہونٹوں پر گفتگو کی تھی۔ میں نے خوش ہو کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا تو اُس نے کوئی جھجک نہ دکھائی۔ میں نے پہلے اُس کی خوبصورت آنکھوں پر بوسے دیے پھر اُس کی خوبصورت ناک کے بانسے پر اور پھر جب اُس نے دیکھ لیا کہ میں اُس کے ہونٹوں پر بھی جھکا چاہتا ہوں تو وہ اچانک میری گرفت سے نکل کر الگ جا بیٹھی بہت ہی اُداس لہجے میں بولی ـــــ "بیٹھ جائیے اور کچھ باتیں کریں"

میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ اُس نے اجازت نہ دے کر میرے اُس کے جذبات کو کچھ ٹھیس پہنچائی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مسرور دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں خود کو شکست خوردہ سمجھنے لگا تھا لیکن میں نے بھی اسی کی مانند اپنے آپ پر قابو پا کر بعض اچھے ڈراموں کا ذکر چھیڑ دیا انسی ٹیمسی ولیمز

اور نادل سرکار کے لکھے ہوتے۔ اُس نے بھی ان ڈرامہ نگاروں کے تخلیقی کام میں بڑی دلچسپی دکھائی اور فوراً
ہی ایسا محسوس ہونے لگا ہمارے درمیان کسی قسم کی ناخوشگواری پیدا ہی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ پہلی عورت
تھی جو میری باہوں میں پہنچ کر بھی نکل گئی تھی جس کی وجہ سے میرے اندر اُسے ٹھیک طرح سے جاننے کی خواہش
بڑھ گئی اس کے لیے میں نے وہی گُر استعمال کیا جو کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ یعنی اس کی تعریف اور وہ واقعی
اس کی بھوکی تھی۔ وہ خود ہی کہہ اٹھی یہ یورپ میں بعض لوگ میری آنکھوں کی رنگت اور ناک کی ساخت کی
وجہ سے گریک سمجھ بیٹھتے ہیں میں انہیں بتاتی ہوں میں خالص ہندوستانی ہوں گریک ہرگز نہیں ہوں تب
بھی انہیں یقین نہیں آتا۔ کہتے ہیں میری ماں ضرور گریک رہی ہو گی۔ اتنی خوبصورتی کمبخت ملک کا ہی ثمر ہو سکتی
ہے" اور وہ بے اختیار ہنستی ہوئی بولی "ایک نوجوان امریکی پروفیسر نے شرط لگا کر مجھے جرمن اور اسپینش نسل
کی مخلوط پیداوار قرار دے دیا تھا۔"

"اور تم وہ شرط جیت گئیں تھیں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"جیتی کیسے نہیں؟" وہ اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلاتی ہوئی بولی: "وہ
دراصل مجھے دو ہزار ڈالر دے کر میرے ساتھ کچھ ملکوں میں گھومنا چاہتا تھا میں نے اُس کی یہ خواہش رد کر دی۔"

اپنی تعریف خود کرنا یا دوسروں کی زبانی سنتے رہنا دراصل ایک قسم کا نشہ ہوتا ہے اس معاملے میں
اُسے میں نے حد معصوم پایا۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے اٹھا تو وہ خود ہی میرے سینے کے ساتھ آ لگی اس بات
کو وہ بھولی نہیں تھی کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری حوصلہ شکنی کی تھی۔ شاید اس لیے وہ مجھے ذہن نشین کرانے
کے لیے بولی "میں آزاد ضرور ہوں لیکن اپنی آزادی کا کسی قیمت پر سودا نہیں کر سکتی ہوں۔ مغربی ماحول کی تربیت
نے میرے اندر اتنی جرأت تو پیدا کر دی ہے ۔۔۔ کہ میں اپنی مرضی سے کسی بھی شخص سے مل سکتی ہوں لیکن
کوئی اگر یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف اپنی ملکیت بنا لے گا تو اُسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا"

میں بڑی خاموشی سے اُس کے ساتھ ساتھ کاریڈور میں چلتا رہا۔ اس نے خود ہی میرا ایک بازو بڑی مضبوطی
سے پکڑ رکھا تھا اور سر اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہوئی کہتی جا رہی تھی "عورت مردوں کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھا
چکی ہے اس دکھ کی داستان کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں جب جب ہندوستان کے بڑے اور چھوٹے
ادیبوں اور آرٹسٹوں سے ملی، انہوں نے مجھے محض ایک عورت سمجھا اپنی بھوک مٹانے کا ایک ذریعہ ۔۔۔
میں ایک عورت کے علاوہ بھی تو کچھ ہوں وہ لوگ اُسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ میرے دل میں

اب اُن کے لیے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تو انہی غیر مہذب لوگوں میں سے ایک ہوں۔"
لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ سے پھر کسی ملنے کا وعدہ کیا مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس
چلی گئی میں نے صرف ایک بار سر گھما کر اُسے دیکھا کہ وہ اپنے اندر مریض کو دبا کر کس انداز سے چلتی ہے؟ وہ
اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر جلدی جلدی ایک طرف جوڑے میں سمیٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔
اُس کی شرٹ کا کونہ اس کی پُرانی جینز میں سے نکل گیا تھا اس نے بھی کاریڈور کا موڑ کاٹنے سے پہلے
سر گھما کر دیکھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرا دی اور ویو کر کے چلی گئی۔

اگلے روز وہ ریہرسل دیکھنے کے لیے اچانک پھر آ گئی تو پہلے کی طرح مسرور تھی۔ اب وہ میرے ہی پاس
کرسی پر بیٹھ کر اداکاری کرنے والوں لوگوں کے بارے میں سرگوشیوں میں تبصرہ کرتی رہی۔ وہ مختلف
موقعوں پر اداکاروں کا اسٹیج پر نمودار ہونے اور مناسب مقامات پر کھڑے ہو کر بولنے کے آرٹ کے
بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اس نے کچھ لائٹ ایفیکٹس کے بارے میں بھی مشورے دیئے جو مفید
تو تھے لیکن ہمارے پاس اتنی تعداد میں آرک لیمپس کی کمی تھی اسپاٹ لائٹس بھی اتنی زیادہ نہیں تھیں
کام ختم ہو جانے کے بعد میں اُسے ایک بار میں لے گیا جو ملکی و غیر ملکی ٹورسٹوں سے بھرا ہوا تھا
کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں ایک میز پر جگہ ملی تو اُس نے اپنے ہونٹوں سے بیئر کا جھاگ پونچھتے
ہوئے بتایا ــــ "میں اپنے اکیسر باپ کے دس بیٹوں اور بیٹیوں میں چھٹی اولاد ہوں میرے
ماں باپ کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اسے اُس کی بڑی بہن نے یقین دلایا تھا کہ
وہ اپنا ایک لڑکا اس کی گود میں ضرور دے دی گی۔ جیسے ہی وہ پیدا ہو گا اور جب وہ اُس کے بچے
کے پیدا ہونے کی خبر سُن کر اپنی بہن کے پاس گئی اور اس کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کر کھڑی ہو گئی تو
وہ صاف مُکر گئی۔ بڑے غرور سے بولی "اری بہن! مانگنا ہے تو بھگوان سے مانگ! کیا کسی انسان نے
بھی اپنی اولاد کو بھیک میں دیا ہے؟" یہ سُن کر اُس بیچاری کے دل پر بڑی چوٹ لگی اُس نے
میرے باپ کو مجبور کر کے خود اس کی ایک اور لڑکی سے شادی کرائی اس نے میرے باپ کو دس بچے
دیئے تھے اور پھر وہ مر بھی گئی میری سوتیلی ماں ابھی تک زندہ ہے۔ اس نے چوٹ کھا کر میرے باپ کی شادی
نہ کرائی ہوتی تو آج میرا بھی کہاں وجود ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئی اور میری سگریٹ اٹھا کر پینے لگی۔ دو چار لمبے لمبے کش لیے اور اپنے گرد بہت سا دھواں بکھیر لیا۔ اور پھر بولی "میرے سارے بھائی نہیں ہمارے باپ کی طرح لمبے تڑنگے ہیں، صرف میں ہی بے حد کمزور اور چھوٹے قد کی رہ گئی ہوں۔ لیکن میری طرح لٹریچر اور آرٹ سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں ہے آپ کو ایک اور دلچسپ بات بتاؤں؟ میں نے اپنے بارے میں اپنے ماں باپ کو ہمیشہ لڑتے جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُن کے درمیان بیس سال کا فاصلہ تو تھا لیکن وہ سمجھتے تھے میں اُن کی جائز اولاد نہیں ہوں کیونکہ میری کوئی پہچان اپنے باپ کی شخصیت کے اندر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی میری اپنی ماں کی۔ لیکن میری ماں اس الزام کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی جس پر وہ انہیں گالی بھی دے بیٹھتی تھی اور اُن کے ہاتھوں سے پٹتی بھی بہت تھی اسی لیے میری تمام ہمدردیاں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن میں اپنے باپ کے خلاف زبان تک نہیں ہلا سکتی تھی بس صرف کڑھ سکتی تھی اور سوچ سکتی تھی شاید اسی طرح رفتہ رفتہ میں نے اپنے ذاتی آزادی کو اہمیت دیا اور اُس کی حفاظت کرنا سیکھا ہے۔"

جب میں اسے اس کے ہوٹل تک چھوڑ آنے کے لیے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو اُسے میں نے بمبئی کے اندر کئی لڑکوں کے ساتھ الجھتے اور انہیں کوستے ہوئے دیکھا بس لڑکے جان بوجھ کر اس کے ساتھ کندھا رگڑتے ہوئے نکل جاتے تو وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر اٹھتی تھی۔ میں تو ان لوگوں سے دامن بچا کر کے سمجھتا ہوں گلیسکر کو بازو کے حلقے میں لیے ہوئے آگے بڑھ جانا ہی بہتر سمجھتا تھا میں نے اُسے ہندوستانی ماحول کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی جو مغربی آداب سے واقف نہیں تھا تو اس نے مجھے بڑی بے خوفی سے ساجی بزدل اور کھوتے مار تک کہہ ڈالا میں نے ہنس کر اسے بتایا۔ "دیکھو یہاں کے لڑکے تو غیر ملکی لڑکیوں کو بھی اسی طرح چھیڑا کرتے ہیں اُن کو دیکھ دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہیں اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔"

اُس نے اسی برہمی سے جواب دیا "میں جانتی ہوں۔ یہاں تو وہ اُن کا لحاظ کر کے خاموش رہ جاتی ہیں لیکن اپنے ملک میں واپس جا کر وہی لڑکیاں اپنے وہاں کے اخباروں میں شکایتوں سے بھرے ہوئے خط چھپواتی ہیں۔ اس سے ہمارے ملک کی کتنی بدنامی ہوتی ہے۔ اس کا یہاں کسی کو احساس نہیں ہے اگر اپنی لڑکیوں کو اس طرح اُن کے ملک میں چھیڑا جاتے تو وہ فوراً تھپڑ مار دیں گی۔ لڑکیوں کو چھیڑنا بھی ایک آرٹ ہوتا ہے اور کوئی بھی لڑکی مردوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر دل ہی دل

میں خوش ہوتی ہے وہ صرف بے ہودگی برداشت نہیں کر سکتی۔"

راستے میں ایک جگہ پوری سڑک کو ایک ٹرک نے گھیر رکھا تھا۔ جس پر عمارتی لکڑی کے تنوں سے تراشے ہوئے بڑے بڑے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ بہت تھوڑی سی جگہ بچی ہوئی تھی وہاں سے موٹریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں بہت دھیرے دھیرے گزر رہی تھیں۔ میں تو ٹریفک میں پھنسی ہوئی ایک رکشا پر سے کود کر نکل گیا لیکن ثمرتی اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی پہلے تو اس نے میری طرف بڑی بے بسی سے دیکھا پھر کچھ غصے سے اپنے سڈول بازو اٹھا کر بولی — "آپ مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتے؟"

اس نے یہ مطالبہ اس قدر اونچی آواز میں کیا تھا کہ آس پاس کے کتنے لوگ ہم دونوں کو گھورنے لگے اور جب میں نے اُسے واقعی اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنی طرف اُتار دیا تو کئی لوگ ہنس دیئے۔ میری تو کانوں کی لوئیں تک سُرخ ہو گئیں لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر ہنسنے لگی۔ جیسے جو کچھ ہوا تھا وہ محض ایک تماشا تھا

پھر دو سال کے بعد ایک روز اچانک میں نے اُسے ناروے کی راجدھانی اوسلو میں دیکھ لیا۔ میں ایک ہیر کٹنگ سیلون میں بال بنوانے کے لیے گیا تھا وہاں وہ بھی ایک اور شخص کے بال تراش رہی تھی جب اس نے میری طرف نظر اُٹھائی تو پہلے تو حیران ہوئی پھر مسکرا دی لیکن اپنے کام میں لگی رہی۔ میں اپنی ہیر ڈریسر کے سامنے سر جھکائے ہوئے بیٹھا یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا وہ جرمنی سے یہاں کیسی پہنچ گئی اور بال تراشنے کے پیشے میں؟ کہیں مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی لیکن میں نے جب جب موقع پاکر اس کی طرف دیکھا اُسے اپنی طرف ویسی ہی دلچسپی سے مُسکراتے ہوئے پایا وہ بھی بار بار میری طرف دیکھ کر خوش ہو رہی تھی میں جب باہر آنے لگا تو وہ لپک کر میرے پیچھے چلی آئی ہیر ڈریسنگ سیلون کا ورکنگ کوٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے بولی ——

"آپ یہاں کب تک ہیں؟ آج میں آپ سے مل سکتی ہوں لیکن دو بجے تک بے حد مصروف ہوں اس کے بعد تو مجھے یہیں سے آکر لے لیجیے یا پھر اپنے ہوٹل کا پتہ بتا دیجیے میں خود آ جاؤں گی۔"

اُسے دیکھ کر میں ابھی تک اپنی خوشی پر قابو نہیں پا سکا تھا شام کے چھ بجے تک میں بھی بہت مصروف تھا اس وقت سیدھا ایک تھیٹر ورکشاپ میں کچھ لوگوں سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ لنچ کے بعد اس کے

ڈراموں پر ایک مباحثے میں شریک ہونا تھا اور شام کو میں جو ڈرامہ دیکھنے کے لیے ٹکٹ لے چکا تھا وہ اتفاق سے مجھے ڈی فیسٹیول سے ملا تھا اور وہ ایک ہی تھا اب تو دوسرا ٹکٹ بھی حاصل کر لینا ناممکن نظر آ رہا تھا پھر بھی میں نے سمرتی کے سامنے یہ تجویز رکھ دی ـــ "تم شام کو فیسٹیول تھیٹر آ جانا۔ ہو سکتا ہے کوئی ٹکٹ کینسل کرانے آ جائے۔ ورنہ میں اپنا ٹکٹ کینسل کرا لوں گا"

اس نے جواب دیا "میں یہ ڈرامہ دیکھ چکی ہوں اس میں رات کو ہی ڈرامہ ختم ہونے کے بعد اسی تھیٹر کے سامنے کلب میں مل جاؤں گی۔"

آخر کار وہ سیلوں کے اندر چلی گئی میں دن بھر اس سے ملنے کے تصور میں کھویا رہا۔ شام کو تھیٹر کے اندر بھی میری نظریں اسی کو تلاش کر رہی تھیں کہ شاید اُسے کسی طرح ٹکٹ حاصل ہو گیا ہو۔ اگرچہ وہ وہاں موجود نہیں تھی لیکن میں جیسے ڈرامے کی ہر ایک سچویشن میں اُسے اپنے ساتھ ہی بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ ڈرامے کا سیٹ، لائیٹ ایفیکٹس، موضوع کی ٹریٹمنٹ وغیرہ جن جن رموز کو وہ سیکھ چکی تھی اور میرے ساتھ کئی بار بحث کر چکی تھی میں اب بھی اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ لگا رہا تھا۔ ڈرامہ عورتوں کی جنسی آزادی سے متعلق تھا۔ اس آزادی کے حصول کے لیے مغرب کی عورت ابھی تک مردوں کے سماج کے ساتھ لڑ رہی تھی، اُن کے مانے ہوئے قوانین کو کورٹ میں چیلنج کر رہی ہے۔ مرد اگرچہ اصولی طور پر اس آزادی کو تسلیم کر چکا ہے لیکن عورت اس کی اس حمایت کو بھی اس کی انفرادی خود غرضی کی علامت سمجھتی ہے۔ اور وہ ڈرامہ اتفاق سے ایک خاتون کا ہی لکھا ہوا تھا۔

ہال سے باہر آیا تو سمرتی جو گلیکر کورین کوٹ پہنے ہوئے تھی انتظار میں کھڑا ہوا پایا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی وہ مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ لپٹ گئی ہم دونوں کلب میں جا کر بیٹھ گئے تو اس نے چھوٹتے ہی کہا ـــ "یہ اچھا ہوا کہ آپ مجھے اس قدر اچانک اس شہر میں مل گئے ان دنوں میں بہت اُداس تھی"

دو ایک پیگ پی لینے کے بعد اس نے بتایا۔ "جو گلیکر کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا ہے اس لیے میں یہاں چلی آئی گرمیوں کی چھٹیوں بھر کے لیے مجھے سیلوں میں جاب مل گئی۔ اتفاق سے اس کام کا ڈپلوما میرے پاس تھا"

میں نے دیکھا وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی پینے لگی تھی لیکن میں نے اسے روکا نہیں۔ اس کا ذہن گھریلو پریشانیوں سے ہٹانے کے لیے اس ڈرامے کے بارے میں بات کرنے لگا جو میں دیکھ کر آیا تھا وہ بولی

"میں موروییک کو جانتی ہوں وہ بہت اچھے اچھے ڈرامے لکھ چکی ہے البتہ کہیں بھی مبہم نہیں ہے ورنہ کئی جدید ڈرامہ نگار ایبسٹریکٹ ہوتے جا رہے ہیں"

جب ڈانس شروع ہو گیا تو ہم بھی فلور پر چلے گئے۔ اس نے میرا ساتھ پسند کیا اور میرے بازوؤں کے حلقے میں
آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی دھن پر آہستہ آہستہ ناچتی رہی۔ اس نے اپنے لمبے بال اب بال کرا لیے تھے۔ اس کا چھوٹے
چھوٹے بالوں سے بھرا ہوا سر میرے سینے کے ساتھ لگ رہا تھا۔ جب دو ایک بار جھک کر میں نے چوم لیا تو وہ سر
اٹھا کر مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی جیسے اس کا اعتماد اچانک لوٹ آیا ہو۔
ہم نے کھانا بھی وہیں کھا لیا تھا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ میری قیام گاہ پر چلی گئی۔ وہاں آدھی سے
زیادہ رات بیت جانے کے باوجود ہماری باتیں ختم نہ ہو سکیں۔ ہم ابھی تک ڈراموں پر ہی گفتگو کر رہے تھے۔ اس
دن وہ اس قدر خوش تھی کہ اسے جتنے ڈراموں کے مکالمے یاد تھے وہ اس نے پوری اداکاری کے ساتھ میرے
سامنے دہرا ڈالے۔ محبت، لڑکپن، شوخی، غصہ، حسد، مکاری، ممتا، دکھ، جنسی خواہش وغیرہ ہر قسم کے جذبات
پر اسے حیرت ناک قدرت حاصل تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ابھی تک میں اس کی صلاحیتوں سے
فائدہ اٹھا ہی نہیں سکا تھا۔ شاید اس غلطی کی تلافی کرنے کے لیے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے
ہندوستان واپس لے چلنے کی پیش کش کر دوں اور اسے آئندہ ہمیشہ ساتھ رکھوں۔ اور انہی لمحوں میں جذبات
سے مغلوب ہو کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں سر سے بہت اوپر اٹھا لیا۔ اس نے بھی ہنستے ہنستے میرے بالوں کو
مضبوطی سے پکڑ کر نوچ لیا۔ پھر میرے سر پر زور زور سے تھپڑ مارنے لگی تاکہ میں اسے نیچے اتار دوں لیکن میں اسے
سیدھا بستر پر لے گیا۔ گہرے اسپرنگ والے بستر پر وہ گرتے ہی کود کر نیچے اتر گئی اور بڑی بے چینی سے ننگے پاؤں
ادھر ادھر گھومنے لگی۔ میں بستر کے کنارے پر بیٹھا لطف سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اس نے میرے ساتھ
ایک بار بھی نظر نہ ملائی پھر میں مایوس ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ میں نے پھر اس کی توہین کر دی
تھی جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ میں کسی دیر تک اس سے معافی مانگنے کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہا۔ پھر اچانک مجھے
احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود نہیں ہے۔ وہ پتہ نہیں کب دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ
گیا ا ... تو الیٹن پر پڑے سے تھے۔ ایک سیدھا، دوسرا الٹا۔ اور اس کا ہرا رین کوٹ کھلی الماری میں
رہا۔

کمرے سے باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے باتھ روم میں بھی
نیچے جانے والی سیڑھی کی طرف بڑھا تو سیڑھیوں کے
خاموشی
رسگریٹ پھونک رہی تھی۔ میں

بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سگریٹ کی ڈبیا اُٹھا کر ایک سگریٹ سُلگانے لگا۔ اُس نے میری طرف بڑی گہری نظر سے دیکھا اور بولی۔ "میں مردوں کی صرف اسی ایک بات سے سخت نفرت کرتی ہوں جب وہ اپنا بھاری بھرکم وجود عورت کے بدن پر زبردستی لاد دیتے ہیں جو گلیگر بھی اسی قسم کا ایک حیوان ہے جسے چھوڑ کر میں یہاں چلی آئی تھی پتہ نہیں! تم لوگوں کو سزا دینے کے لیے کب کوئی قانون بنایا جائے گا؟ اس کے لیے تو موت کی سزا ہونی چاہیئے۔ بھوٹانی زندہ ہوتا تو اُسے میں اپنے ہاتھوں سے گولی کا نشانہ بنا دیتی مردوں سے نفرت کرنا مجھے اُسی نے سکھایا ہے۔ شاید اب میں زندگی بھر اس نفرت سے چھٹکارا نہیں پا سکوں گی"

یہ کہتے کہتے وہ اپنے گھٹنوں پر سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ایک جانور کی کتھا

سوشل سائنس میں ایم اے کر لینے کے بعد وہ اچانک شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لیے ایک
کمرشل ٹریننگ اسکول میں جانے لگی تھی، جو اس کے گھر سے پانچ کلومیٹر دور تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ وہاں
دن میں ایک ہی بس چلتی تھی بس کے آنے جانے کا وقفہ سرکاری طور پر ایک گھنٹہ رکھا گیا تھا لیکن عام
طور پر دو تین گھنٹے گزر جاتے تھے بس کے آنے میں کبھی کبھی تو بس اچانک منسوخ کر دی جاتی تھی۔ پوچھے
پر بتایا جاتا تھا کہ ریلی بھیج دی گئی ہے کیونکہ اندرا گاندھی آنے والی ہیں ان کے استقبال کے
لیے یوپی کے سارے ڈپوؤں سے دو دو، چار چار بسیں لی گئی ہیں اس طرح پورا ہفتہ ان کی واپسی
میں نکل جاتا تھا۔ تب سے دور بسائی گئی کالونی کے دس ہزار سے زائد باسیوں میں جو معدودے چند یا لوگ بس
اور شاکی تھے، چوبیس برس کی ایک لڑکی رخسانہ شیرازی بھی تھی جو سائیکل تو چلا جانتی تھی لیکن
کئی برس تک یونیورسٹی تک آنے جانے کے بعد اچانک اس سواری سے بیزاری ہو گئی تھی۔ اب اس
کی سائیکل گھر کی دیوار کے ساتھ لگی زنگ کھا رہی تھی۔ ٹائر ٹیوب تک گل سڑ گئی تھیں اور وہ روزانہ
بس اسٹینڈ پر بس مل جانے کی امید میں صبح سویرے جا کر کھڑی ہو جاتی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا بس کا
کوئی ٹھکانہ نہیں ہے وہاں کی چھوٹی سی مارکیٹ کے دکاندار اور دوسرے کئی لوگ دیکھتے رہتے تھے
کہ وہاں ایک دبلی پتلی، لمبی لڑکی، جو ناک نقشے اور بالوں اور لباس کے اعتبار سے خاصی دلکش ہے

لا ناچہ آ کر کھڑی ہو جاتی ہے ایک ہاتھ میں پرس اور چھوٹی سی نوٹ بک اُٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے بار بار پھسل آنے والے سیاہ فریم والے چشمے کو ناک پر جماتی ہوئی۔

میں وہیں سے روزانہ سگریٹ کا ایک پیکٹ اور پان خریدتا تھا اور اس کی طرف ایک اُٹھتی ہوئی نظر ڈال کر اپنی اسکوٹر آگے بڑھائے جاتا تھا۔ جیسے دماغ کی کوئی ایک رَو اچانک ایسا کام شروع کر دیتی ہے اور آدمی اس کے تابع ہو کر رہ جاتا ہے میں نے ایک روز اس کے قریب جا کر اسکوٹر کی رفتار دھیمی کر دی اور بے ساختہ پوچھ لیا "آپ کو کہاں تک لفٹ دے سکتا ہوں؟ اگر آپ پسند فرمائیں تو!"

اسی روز شام کو سماجیات میں پوسٹ گریجویٹ کلاس میں آنے والی لڑکی ایک ریستوراں میں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی بنا کسی جھجک کے اپنی دلچسپیوں کا ذکر کر رہی تھی "مجھے مرغی اور مچھلی بہت مرغوب ہیں میں خود بھی ایک بہت اچھی کُک ہوں۔ واقعی! یقین نہ آئے تو کسی روز تشریف لے آئیے۔ بنا کر کھلاؤں گی لیکن ذرا پہلے سے بتا دینا ہوگا اور ہاں، مجھے اچھے کپڑے پہننے کا بھی بڑا شوق ہے اگرچہ ہمارے وسائل اب محدود ہیں میری ممی اب سروس نہیں کرتیں آرتھرائیٹس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی ہیں بیچاری! میری چھوٹی بہن کو حال ہی میں ایک سروس ملی ہے، خیر میری ایک خالہ جو کویت میں ہیں وہاں سے انھوں نے میرے لیے ایک بہت خوبصورت میکسی بھجوائی تھی کبھی کبھی پہن کر نکلتی ہوں۔ شاید آپ نے اس لباس میں مجھے ابھی تک نہیں دیکھا ہوگا۔"

اب یہ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ میں آپ کو اتنی تفصیل بھی بتاؤں کہ وہ میرے ساتھ کیوں ہر روز کالونی سے شہر تک آنے لگی تھی اگرچہ خاص حلقوں میں ہم دونوں کے بارے میں ایک چھوٹا سا اسکینڈل بھی مشہور ہو گیا تھا لیکن ہم کسی کی پرواہ کیے بغیر ایک دوسرے سے آزادی سے ملتے جلتے رہے جو ملاقاتیں یہ بھی کہ اس کی ماں کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور اُس کے ماموں کو بھی جو ہمیں اکثر اپنے یہاں دعوت پر بلا لیتے تھے یہ بالکل واضح تھا کہ رخسانہ اور اُس کے گھر والے میرے جیسے ہی کسی نوجوان کی تلاش میں تھے جو برسرِ روزگار ہو اور پوری آزادی سے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہو شاید اس سے پہلے بھی وہ اسی طرح رخسانہ کے کچھ دوستوں کو آزما چکے تھے

میں نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کہا اپنے والدین کے چھ بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سب سے آخری اولاد ہوں میں جو گھر کے ہجوم اور متضاد مزاجوں سے گھبرا کر اپنی زندگی خود بنانے کے لیے مجبور ہوا

یونیورسٹی میں تین مارٹیل ہوا اور ایک شراب سازی والی فیکٹری میں بوتلوں پر لیبل چپکانے والی مشین پر کام کیا اور ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی چلائی اخبارات کے لیے سٹی کلچر پر کالم لکھے پھر اچانک فلمی کالم لکھنے کی مہارت حاصل ہو گئی تو اسی پیشے کی بدولت ممبئی کے کئی نگار خانوں اور بڑے بڑے آرٹسٹوں کے قریب پہنچ گیا۔ اب دو رسالوں کے مشہور فلمی رسالوں کے ساتھ وابستہ ہوں اور روٹی روزی کی کڑی مشقت سے کافی حد تک بے نیاز ہوں کھانا اکثر بے تکلف دوستوں کے ساتھ اُن کے گھر پر یا پھر ہوٹل میں کھاتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں جو مجھے صوبائی حکومت نے جرنلسٹوں کے کوٹے میں سے قسطوں پر دے دیا ہے۔ فون بھی لگا ہوا ہے دو ایک ناکام عشق بھی کر چکا ہوں لیکن اُن کی وجہ سے افسردہ ہرگز نہیں ہوں بس خوش ہوں اور پُرامید ہوں اور اس فلسفے پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ زندگی بہر طور گزر جاتی ہے

جس سال ہماری جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے فلم ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تھا میں ہی اس کمیٹی کا کرتا دھرتا تھا کوئی بھی ایسا بڑا فنکشن صرف عوامی تعاون سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے بڑے بڑے بااثر لوگوں کی سرپرستی حاصل کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے جیسے منسٹر لوگ، مختلف محکموں کے ایسے سکریٹری صاحبان جو مشہور و معروف اداکاروں کے ساتھ ہاتھ ملا کر فخر محسوس کریں اور اپنے خاص ذرائع سے ایسوسی ایشن کے سووینیر کے لیے اشتہار بھی دلائیں یا فنڈ جمع کرا دیں انہی لوگوں کی بدولت بڑے بڑے ہوٹلوں میں ڈنر وغیرہ کے انتظامات بھی جمع ہو جاتے ہیں اگرچہ میرے سارے ساتھی جرنلسٹ پہلے فنکشن کو کامیاب بنانے کے لیے بھاگے بھاگے پھرتے تھے لیکن مجھے اچانک رخسانہ شیرازی جیسی اسمارٹ اور دلکش لڑکی کو اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنا لینے کا خیال سوجھ گیا تھا یوں بھی وہ فلم ایوارڈ فنکشن کے چمک دمک کے تصور میں کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی تھی اب ہر وقت میرے ساتھ اسکوٹر پر دوڑنے پھرنے لگی اُس کی شاندار پرسنالٹی میرے لیے کامیابی کا ایک زینہ بن گئی۔ کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر یعنی ہماری عام گھریلو لڑکیاں کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہوں اُن کے ساتھ اگر علم و فلم والا کوئی گلیمر نہ ہو تو انہیں کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا لیکن ایک محکمے کا سکریٹری اس پر دل و جان سے فدا ہو گیا اور وہ اسے اکثر کسی نہ کسی بڑے ہوٹل میں کھانے پر انوائیٹ کرنے لگا رخسانہ کی طرف اس کی پیش قدمی دیکھ کر میرے دل میں کسی قسم کا حسد پیدا نہ ہوا اس لیے کہ میں نے اُسے

ابھی تک ایک محبت کرنے والے عاشق کی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا وہ میری ایک اچھی دوست تھی
بس! لیکن اُن کے معاملے میں میری دلچسپی اس حد تک ضروری تھی کہ وہ کتنے سیدھے ثابت ہوتے ہیں
اسحاق بھائی بھارت والا کرناٹک کا باشندہ تھا آئی اے ایس سروس کی وجہ سے شمالی ہندوستان
آگیا تھا پچاس برس کا ہوچکا تھا شادی شدہ تھا۔ اس کے دو بچے یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے لیکن
بیوی اور بچوں کے ساتھ اس کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے بیوی اپنی جنسی خواہشات کا گلا کئی برس عرصہ
خاتمہ کرچکی تھی اب اس کی نظر اپنے شوہر کی کمائی پر تھی وہ اُسے ہر جائز ناجائز طریقے سے زیادہ
سے زیادہ روپیہ کمانے پر مجبور کررہی تھی اُن کے بچے بھی اپنی ماں کے ہمنوا تھے۔ اسحاق بھائی اُتر پردیش
کی حکومت میں ایک بہت ہی اہم افسر تھا۔ بے حد خوشگوار اور دلچسپ شخصیت کا مالک، لیکن گھر کی
تلخیوں نے اُس کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا وہ اپنے ہی بنگلے میں ایک ناپسندیدہ گیسٹ کی طرح رہتا تھا
اُسے اکثر و بیشتر گھر سے باہر ہوٹلوں میں کھانا پڑتا تھا۔

فلم ایوارڈ فنکشن بُری طرح ناکام رہا تھا کیونکہ میں نے ایسے ایسے اداکاروں کو ایوارڈ دیئے
تھے جن کی کئی کئی فلمیں فلاپ ہوچکی تھیں لیکن ان اداکاروں نے ایوارڈ کے ذریعے پبلسٹی حاصل
کرنے کے لیے اپنے رسوخ سے کئی فلم سازوں سے اشتہارات بھی دلا دیئے تھے جن کی وصولی کی بھی
اب کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی میں رسالہ اور اسحاق بھائی کو بھول کر بمبئی چلا گیا تھا تاکہ فلمسازوں
سے جتنا روپیہ مل جائے اُسے غنیمت جان کر قبول کرلوں اتفاق سے ایک فلم ساز کے بارے میں بھنک
ملی کہ اُسے کسی بہت ہی چالو قسم کی کہانی کی تلاش ہے میں نے فلمی دنیا کے دو ناکام کہانی کاروں کے
ساتھ رابطہ قائم کیا کیونکہ اب اُن کا لکھا ہوا بھی معمولی داموں پر نہیں بک رہا تھا لیکن میں نے اُن کے ساتھ
پچاس فیصد پر سودا طے کرکے یہ شرط بھی منوالی کہ کہانیاں اُن کے نام سے نہیں بلکہ ایک فرضی نام سے
بکیں گی اس طرح میں ایک کہانی بکوانے میں کامیاب ہوگیا جس سے مجھے دس ہزار کا ہینگ پھٹکری
لگائے بغیر فائدہ ہوگیا اسی فلم کے پبلسٹی کالم لکھنے کا بھی کام میں نے حاصل کیا دو سال بعد بمبئی سے
واپس آیا تو اپنے صوبائی اخباروں میں مستقل کالم لکھنے کا کام جیسے منتظر تھا میرا قلم فلمی اسکینڈل
گڑھنے کے علاوہ تبصرے وغیرہ کا کام سنبھالنے کے لیے بھی پوری طرح منجھ چکا تھا۔

جس طرح گھر لوٹ کر وہاں کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو پھر سے دیکھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے میں

تو اپنے شہر میں پرانی روایتوں کے مانے بڑے دائرے میں اس خوبصورت ہستی کو کسی تلاش کرنے سے
باز نہ آسکا۔ جس کی بے تکلفی کا میں بھی دلدادہ ہو چکا تھا۔۔۔ وہ اتنی معصوم تھی کہ میری ہر بات کا اعتبار کرلیتی
تھی اتنی آزاد تھی کہ میں اُسے اپنے فلیٹ میں روک لیتا تھا تو وہ ہنستے ہنستے سر گھر جانے کا نام نہیں لیتی
تھی میری ڈاک دیکھتی تھی میرے خطوط اور مسودے ٹائپ کر دیتی تھی، وقت بے وقت کپڑے بھی دھو دیتی
تھی فرش صاف کر کے پوچا بھی مار دیتی تھی چائے، کافی، ناشتہ وغیرہ بنا دیا تو اُس کی فطری کمزوری تھی
کیونکہ ایسا کر کے وہ بے حد خوش نظر آتی تھی لیکن وہ اس قدر چالاک بھی یقیناً تھی کہ اس کی نظر اپنے
مستقبل پر بھی نہیں رہتی تھی میں اُسے اسحاق بھائی سات والا کے حوالے کر کے گیا تھا مجھے نہیں
معلوم تھا کہ وہ اب کس حال میں تھی ایک روز اسکوٹر کا رُخ بے اختیار اس کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ اُسکی
ماں اگر زندہ ہوئی تو سارا ماجرا معلوم ہو جائے گا۔

وہاں جا کر پتہ چلا اُس کی ماں ایک سال ہوا اپنی چھوٹی بیٹی کو ساتھ لے کر اپنے بھائی کے پاس
کراچی چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سے اُن کو کسی کو خبر نہ تھی۔ مکان کا کرایہ ادا کر کے بھی نہیں گئی تھی مالک
مکان نے پولیس کی مدد سے تالا توڑ کر مکان اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

مالک مکان ہی نے مجھے بتایا اُس کی بڑی بیٹی کو بھی اپنی ماں اور بہن کے بارے میں کوئی اطلاع
نہیں تھی کیونکہ اُس کے تمام خط وہاں آتے ہوئے رکھے تھے۔ مالک مکان نے مجھے اُن کا ایک
واقف کار جان کر رخسانہ کے سارے خطوط میرے حوالے کر دیئے جنھیں اپنے فلیٹ پر لا کر میں نے
ایک ترتیب سے پڑھا تو معلوم ہوا، اس نے اپنی والدہ کی رضامندی لیے بغیر اسحاق بھائی سے نکاح کر لیا
تھا اسحاق بھائی نے دوسری شادی کے بعد فوراً اپنا تبادلہ دلی کرا لیا تھا وہاں اس نے ایک فلیٹ
تو اپنی پہلی بیوی اور اس کے دو بچوں کے لیے الاٹ کرایا تھا ایک دوسرا فلیٹ جو سرکاری تھا اپنے اور
رخسانہ کے لیے رکھا ہوا تھا چند ماہ تک یہی انتظام چلتا رہا وہ پوری تنخواہ پہلی بیوی کو چیک کے ذریعے
بھجوا دیتا تھا اوپر کی آمدنی پر اپنے اور رخسانہ کے اخراجات برداشت کرتا تھا۔ رخسانہ نے اپنی والدہ کو
لکھا تھا چند ماہ تو ٹھیک ٹھیک گزر گئے پھر اچانک وہ ایک مقدمے میں پھنس گیا جس کی وجہ سے سروس
سے معطل بھی کر دیا گیا معطل ہو جانے کے بعد اُس نے رخسانہ کو ایک فیکٹری میں استقبالیہ گرل کی سروس
دلوا دی اور اس کی تنخواہ پر گزارا کرنے لگا اسی دوران میں اس کی پہلی بیوی نے اس کے خلاف مقدمہ

دائر کر دیا کہ اس کے کچھ حصے مکس ڈیپارٹ بھی ہیں جو اسے اور اس کے بچوں کو دلا دیئے جائیں۔ اسحاق بھائی نے خدا کی قسم کھا کر بتایا تھا کہ اس نے کبھی روپیہ چھپا کر یا بچا کر نہیں رکھا۔ اس نے شراب نوشی بھی ترک کر دی جن لوگوں کو وہ فائدے پہنچا رہا تھا اُن میں دو ایک اب بھی اس کے وفادار تھے کیونکہ انہیں اُمید تھی کہ وہ ایک نہ ایک روز مقدمے سے بری ہو کر اپنی اصلی پوسٹ پر واپس چلا جائے گا اور انہیں پھر فائدے پہنچائے گا وہی لوگ اُسے شراب پلایا کرتے تھے

ایک خط میں رخسانہ نے اپنی ماں کو اطلاع دی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے اور یہ خبر سن کر اُس کے شوہر کو بے حد غصہ آ گیا، اسے بُری طرح پیٹا تھا۔ اس وقت وہ شراب کے نشے میں گھر لوٹا تھا کہتا تھا یہ میرا بچہ نہیں ہو سکتا کسی اور سے تعلق کا نتیجہ ہو گا۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کے بارے میں بھی الٹی سیدھی باتیں کیں کہ اُس نے بھی حرامی اولاد پیدا کی تھی اس کی اپنی اولاد ہوتی تو اس کے خلاف اپنی ماں کے ساتھ کیوں ہو گئی۔ رخسانہ کا خیال تھا، وہ اب پاگل پن کے قریب پہنچ گیا ہے، اگر مقدمہ ہار گیا تو وہ بالکل تہہ بالا ہو جائے گی لیکن بعد کے خطوط میں رخسانہ نے بیمار پریشانیوں کا ذکر کیا تھا کبھی جان تک دے دینے کا بھی، کیونکہ اسے اپنی والدہ کی طرف سے اپنے کسی خط کا جواب نہیں مل رہا تھا وہ اپنی ملازمت اور اس پاگل بیمار شوہر کو چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتی تھی اُس کا بچہ صرف تین ماہ کا تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے وہ ایک مشن ہاؤس میں ایک بوڑھی دایہ کے پاس رکھ کر پال رہی تھی

اس نے اپنے آخری خط میں ماں کو لکھا تھا۔ "مجھے احساس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی جب سے میں نے شادی کی یہ میرے اختیار میں بھی نہیں تھا لیکن آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ جب بھی ضرورت پڑے آپ میرے ایک بہت اچھے دوست کے پاس جا سکتی ہیں یا اسے بلا کر جو کچھ چاہیں اس سے مانگ سکتی ہیں مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے اس دنیا میں وہی ایک ایسا شخص ہے جو میرا کوئی بھی کام کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتا ایسا لگتا ہے وہ میری ہی ہر مدد کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے یہ پڑھ کر آپ پوچھ سکتی ہیں کہ اگر ایسا تھا تو پھر میں نے اس کے ساتھ کیوں نہ شادی کر لی؟ سچ سچ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مجھے میں بھی اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں مجھے یقین ہے وہ ہرگز انکار نہ کرتا، لیکن پتہ نہیں کیوں، میں ایسا نہ کر سکی۔ جب کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہ چکے ہیں اتنے قریب کہ اس کے بعد علیحدگی کا کوئی تصور کرنا بھی محض حماقت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں نے جب بھی اس سلسلے

میں سوچا میرے ذہن میں ایک دیوار سی اُبھر آئی وہ دیوار آپ کی اور ہمارے مذہب کی تعمیر کی ہوئی تھی لیکن یہ کتنا عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مجھے ہر آفت سے بچانے کے لیے اپنی پناہ میں لے سکتا ہو وہ شادی جیسے فیصلہ کُن لمحے میں ایک غیر کیوں محسوس ہونے لگتا تھا! خیر میں اس سلسلے میں زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتی جو ہو چکا سو ہو چکا میں اس کا پتہ لکھے دے رہی ہوں خدا کرے وہ بمبئی سے واپس آچکا ہو اور ابھی تک آپ کے شہر میں رہ رہا ہو!

رخسانہ کا آخری خط پڑھ کر میں حیران رہ گیا سوچ میں پڑ گیا کبھی کبھی آدمی اپنے طور پر دو مردوں کے احساسات کے بارے میں بالکل بے خبر کیوں رہتا ہے؟ اپنی ہی ہمدردی کے جذباتی ایاجال میں پھنسا ہوا جس میں سے منطقی طور پر بھی نکلنے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتا۔

میں نے ان لمحوں میں خود کو بے حد خود غرض اور چھوٹا محسوس کیا کہ میں اُسے محض گوشت پوست کی ایک خوبصورت گڑیا کیوں سمجھتا رہا تھا حالانکہ وہ ایک خوبصورت جسم کے علاوہ بھی بہت کچھ تھی۔ اچانک مجھے ایسا لگا کوئی میرے دروازے پر پہنچ کر باہر ہی رُک گیا ہو! میرے سامنے بکھرے ہوئے خطوط دیکھ کر میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ کمرے کے دروازے کے باہر جا کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا نیچے سے اُوپر آنے والی سیڑھیاں خالی تھیں بالکل خاموش اور ایک بے پناہ سناٹے میں ڈوبی ہوئی سی!

رخسانہ سے میری ایک اور ملاقات ایک لمبی مدت کے بعد اچانک دلی میں ہو گئی تھی جب میں اسٹیٹ بنک سے ٹریولر چیک لے کر باہر آ رہا تھا وہ ایسے ہی ننھے سے بچے کو انگلی سے لگائے بس کے انتظار میں کنٹو میں کھڑی تھی ایک دوسرے کی طرف ہماری نظریں ایک ساتھ اُٹھیں اور ہم تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ گئے وہ بھی سڑک پر میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑی آس پاس کتنے لوگوں نے ہماری طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا تھا پھر میں اُس کے بچے کو گود میں اُٹھا کر رخسانہ کے ساتھ ایک ریستوراں میں جا بیٹھا تھا میں نے اُسے بتایا تھا۔ "آج اتفاق سے میں کوپن ہاگن جا رہا ہوں وہاں میرا ایک دوست جو کئی سال پہلے بمبئی میں فلم فائنانس کارپوریشن میں انڈر سکریٹری تھا اب ڈنمارک میں ہمارے سفارت خانے کا کلچرل اتاشی ہے۔ اُس نے میرے مشورے سے وہاں دس منتخب بھارتی فلموں کی نمائش کا اہتمام کیا ہے جس کی رپورٹنگ کرنے کے لیے میں دو ہفتوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

اس نے میری طرف بڑی خاموشی سے دیکھا۔ اُس کی خاموش گہری آنکھوں میں ایک متلاطم

سمندر سفر آیا میں جانتا تھا، وہ میری ہم جولیوں سے بھرپور زندگی کی بہترین ساتھی رہ چکی تھی۔ صرف اُس کے ساتھ رہنے سے میں نے ایک فلم فیسٹول کے لیے ہزاروں روپے جمع کر لیے تھے ـــــ اگر وہ میرے پہلے پہلے غیر ملکی سفر میں بھی میرے ساتھ ہوتی تو میرا سفر بے حد خوشگوار ثابت ہو سکتا تھا اس معاملے میں وہ ایک مکمل رفیق تھی جو آگے بڑھنے کے لیے بے پناہ حوصلہ اور قوت اعتماد دے دیتی تھی۔
لیکن اب فوراً ہی یہ سب کر لینا ناممکن سا لگا۔

اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں تو میں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا "میں سب جانتا ہوں۔ تمہیں کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک لمحہ بھی نہیں اگر تم یہاں سے لوٹ کر لکھنؤ جانا چاہو تو میں تمہیں اپنے فلیٹ کی چابی دے سکتا ہوں۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ آئی پرامس"

یہ کہہ کر میں نے جیب سے چابی نکالی اور اس کے ہاتھ پر رکھ دی، جسے وہ کچھ لمحوں تک بے ارادہ ہی اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی جیسے وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو۔ پھر اچانک چابی کو میری طرف سرکاتے ہوئے بولی "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ پہلے شوہر سے نجات پا کر میں ایک اور آدمی سے شادی کر چکی ہوں۔ وہ ملٹری کا ریٹائرڈ کیپٹن ہے۔ بہت بڑا شکاری بھی ہے اور دریا آباد کے جنگل کا سیر ہے اور اکیلا ہے۔ اُسے طرح طرح کے جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔ میں بھی تو ایک جانور ہوں! مجھے یقین ہے وہ مجھے بھی بہت جلد پالتو بنا لے گا۔ وہاں اُس کی تھوڑی سی زمین ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی۔ اُمید ہے یہ نیا ماحول مجھے راس آجائے گا۔ ہم چند روز کے بعد وہیں جا رہے ہیں"

ـــ کوشش ـــ

سیڑھیاں

دیویند دسلوک کے نئے گھر تک پہنچنے میں خاصی پریشانی ہوئی اگرچہ اُس نے فون پر سارا
نقشہ سمجھا دیا تھا ڈیپلائنٹ کے پاس اُتر کر پہلی گلی میں مڑ جانا پھر سو قدم چل کر دائیں ہاتھ ہو لینا ساتواں مکان
چھوڑ کر ایک کمرشیل، ٹائپ رائٹنگ اسکول کا بورڈ لگا ہوا نظر آئے گا اسی سے ملا ہوا تین منزلہ مکان
ہے وہی اس غریب کی کٹیا ہے جس پر ابھی تک کوئی نیم پلیٹ لگی ہے اور نہ ہی مکان نمبر پڑا ہے۔ بس
یہی اس کی شناخت ہے

دراصل میں مدھی گووند کے سفر کیلئے مکّ اپ کی وجہ سے اپنے اندر بڑی اُلجھن محسوس کرتا ہوا آیا
تھا ساٹھ برس کے ایک سنجیدہ آدمی کے پہلو بہ پہلو کوئی تیس برس کی لڑکی گلیمر کا ایک اشتہار سا بنی ہوئی
چل رہی ہو تو وہ یوں بھی راستہ کھول جائے گا اس کے بار بار کہنے کے باوجود میں کافی آگے بڑھ
گیا اور پھر جب ایک لمبا چکر کاٹ کر ہی دسلوک کے مکان کے سامنے پہنچا تو مدھی کے چہرے پر
ایک خشک استہزائیہ مسکراہٹ دیکھ کر بس اندر ہی اندر گھول گیا اسے ساتھ لے آ کر میں نے سخت
غلطی کی ہے۔ پچھلے ایک ہفتے کے سفر کے دوران میں کئی بار اُس نے ایسی ہی ناخوشگواری کا تاثر
دیا ہے جبکہ میں اس کے چہرے پر اس کی فطری دلنشیں مسکراہٹ ہی دیکھنے کی توقع کر رہا تھا۔
اس نے مجھے خاصا مایوس کیا تھا لیکن اس سے یہ سب کہنے کا یہ موقع نہیں تھا میں خاموشی سے

اوپر کے فلیٹ تک پہنچنے کے لیے قدم اٹھا یا گیا

ایک اونچے قد کے نوجوان نے ہمارے لیے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر غائب ہوگیا۔ میں نے دیکھا ندھی کو مدحو اس کا نظروں سے تعاقب کرتی رہی تھی۔ اب تک بڑے اطمینان سے اپنے پرس میں سے آئینہ نکال کر اپنے چہرہ کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسی لمحے لعل کے کمرے کا پردہ اٹھا کر دیویندر سلوک پرگٹ ہوگیا

"ہیلو!"

وہ لپک کر میرے سینے سے لپٹ گیا۔

"یار تم تو بالکل عید کا چاند ہوگئے!"

پھر میرے قریب دوسرے صوفے پر ایک خوشنما گڑیا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے مدھی واقعی ایک گڑیا جیسی ہی لگ رہی تھی۔ پورا لباس سفید کریپ کا۔ گال، ہونٹ، ناخن۔۔۔ سب گہرے لال رنگ میں پتے ہوتے اور اس کے بال بھی کھلے ہوئے۔۔۔ جھولتے ہوئے

میں نے اس کا تعارف کرایا

"یہ مدھی ہے۔ میری جونیر۔ کہنے لگی آپ کے ساتھ دہلی جا کر کچھ پرانے فرینڈز سے بھی مل لوں گی"

"اچھا اچھا!" وہ بڑی خوش دلی سے بولا جلدی سے اپنی بیوی اور بہو کو بھی بلا لایا۔

"تم لوگ بھی یہاں آجاؤ"

اپنے لوگوں کے سامنے دوسری عورتوں کی طرف دیکھنا بہت آسان ہوجاتا ہے ہمارے آنے سے پہلے وہ دوسرے کمرے میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا ہم دونوں کے لیے بھی وہ مگ اور بوتلیں اٹھا لایا۔

"لو تم بھی پیو جی خوش ہوگیا تم سے مل کر"

پھر میری جونیر کی طرف پلٹ کر بولا۔۔۔ "کیا نام بتایا گیا تمہارا۔۔۔؟ مدھی! بہت پیارا نام ہے۔ لو، تم بھی اپنا مگ اٹھاؤ۔ تمہیں بیئر پسند نہ ہو تو کوئی اور لائیٹ ڈرنک پیش کردوں؟"

جی نہیں تھینکس یہی ٹھیک ہے"۔ مدھی نے مگ اٹھا لیا اور مسز سلوک اور اس کی بیوی کے پاس جا بیٹھی۔ وہ اپنے اپنے مگ اٹھاتے وہاں آگئی تھیں۔

"یار تم ہمارے بیٹے کی شادی میں کیوں نہیں پہنچے تھے، مبارکباد کا تار بھوا کر ہی جیسے سبکدوش
ہو گئے بات تو پرانی ہو چکی ہے لیکن تمہاری غیر حاضری میں ابھی تک نہیں بھول پایا" پھر وہ ہنسنے لگا۔
"اب تو اس کی ایک بیٹی بھی ہو چکی ہے"
اس نے پلٹ کر بہو کو آواز دی ــــ بہو! ذرا گڈو کو تو اٹھا کر لے آنا"
اس کی بہو اپنی ننھی سی گڑیا کو اٹھا کر لے آئی تو وہ بولا ــــ "یہ بھی اس کے ماں باپ میں۔ ڈال دے
اس کی گود میں گڈو کو"
میں نے بچی کو دونوں بازوؤں میں لے لیا اُسے پیار کیا اس کی پیاری پیاری حیران آنکھوں
میں جھانک کر دیکھا اور خوش ہو کر ہنس پڑا۔
"ٹیٹو کہاں ہے یار۔ شاید بارہ سال ہو گئے اُسے دیکھے ہوئے!"
"لو ــــ تم نے ابھی تک اُسے پہچانا ہی نہیں!" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہی تو تم لوگوں کو
اندر لا کر بٹھا گیا تھا۔" اس نے پلٹ کر کمل کو پکارا۔
"اب اسے ہم ٹیٹو نہیں کہتے بڑا ہو گیا ہے نا چڑتا ہے بچپن کے نام سے۔"
وہ پھر ہنسنے لگا اور دوسرے ہی لمحے میرے سامنے وہی لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا تھا حسن کے
سڈول اونچے جسم پر ٹی شرٹ اور جینس بالکل منڈھی ہوئی سی لگتی تھیں اور وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر ایسے
مسکرا رہا تھا جیسے ہنسی اڑانے میں اپنے باپ کا ساتھ دے رہا ہو میں کوشش کے باوجود اس
میں دس گیارہ برس کا گول مٹول سا اور بے حد معصوم لڑکا نہ ڈھونڈ سکا ــــ کبھی کبھی کسی کا بچپن بہت
زیادہ بھی گم ہو جاتا ہے کسی بیش قیمت شے کی طرح ایک صدمہ سا محسوس کیا لیکن مسکرا کر کہا ــــ
"اچھا تو یہ تم ہو!"
میں نے اس کی بیوی کو بتایا ــــ "یہ لڑکا میرے ساتھ لمبی لمبی دوڑیں لگایا کرتا تھا اور مجھ
سے ہمیشہ آگے نکل جاتا تھا"
ہم سب زور زور سے ہنس رہے تھے صرف ٹیٹو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جب چھوٹا تھا تو جب
کھل کر ہنستا تھا بلا وجہ قہقہے لگاتا تھا جس سے سارا گھر گونج اٹھتا تھا سلوک نے کسی خط میں لکھا
تھا۔ "ہمارا بیٹا اب ایک باصلاحیت آرکیٹیکٹ ہے۔ بڑی بڑی ملٹی اسٹوریز کے ماڈل بناتا ہے

دو بار مقابلے میں انعام بھی پا چکا ہے ۔۔۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے تاکا اور سوچا۔ کیا اسے اس
کی سر سے اونچا اٹھا کر گدگدا سکتا ہوں ؟ شاید نہیں شاید کبھی نہیں

اسی طرح صدمے اور سوچ میں ڈوبا دوبا صوفے پر بیٹھ گیا۔ سلوک نے کہا۔ "یار تم تو انکم ٹیکس
کے بہت بڑے وکیل ہو۔ میری بھی کچھ مدد کرو ہمیں اس سال ڈیڑھ ایک لاکھ کی آمدنی ہونے والی
ہے اسے کس طرح انویسٹ کریں کہ انکم ٹیکس دیے بے بچ جائیں؟"

ہم دونوں کاروباری گفتگو میں کھو گئے ۔" تم اس طرح کرو۔ تمیں پالیسیں کی تو سب کی
انشورنس کرالو اپنی نومولود پوتی کی بھی ۔۔ چھ سات ہزار کی کس اس پر انکم ٹیکس کے سیکشن اسّی سی
کے مطابق سو فیصد رعائت مل جائے گی اور ہر کس کی ٹیکس ادا کرنے کی آمدنی صرف پندرہ ہزار رہ جائے
گی ۔۔ اٹھائیس ہزار ۔۔۔ مائنس چھ ہزار ۔۔۔ مائنس سات ہزار ۔۔ برابر پندرہ ہزار، جس پر کوئی ٹیکس
نہیں لگتا ہے، سمجھے ؟"

میرے کانوں میں اچانک مدھی کی فون پر بات کرنے کی آواز آئی مڑ کر دیکھا وہ کونے
والی میز کے سامنے بیٹھی کسی کے ساتھ چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی ساڑیوں و ملاؤزوں کے رنگوں
اور ڈیزائنوں کے بارے میں گذشتہ دورہ میں جن جن دکانوں پر وہ شاپنگ کرتی پھری تھی، ان
کے نام و پتے فر فر بتا رہی تھی۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اس سے صاف صاف کہہ دیا۔

"تم کبھی اچھی وکیل نہیں بن پاؤگی۔ بہتر ہوگا کسی ایسے آدمی کے ساتھ شادی کر لو جو تمہارے
نخرے برداشت کر سکے "

یہ سن کر وہ سناٹے میں آ گئی۔ فون بند کر کے بولی "سب کے سامنے میری اس طرح
انسلٹ کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا "

میں نے کھسیا کر جواب دیا۔" میں یہ کہنا چاہتا تھا تمہاری وکالت کے پیشے میں اگر دلچسپی
نہیں ہے تو میرے ساتھ آنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟"

جہاں ہمارا قیام تھا وہاں بھی وہ کسی نہ کسی کے ساتھ فون پر گفتگو چلاتی رہتی تھی۔ ہم جس جس
گھر میں گئے وہاں جاتے ہی اس نے پہلی نگاہ میں تاڑ لیا تھا کہ فون کہاں رکھا ہوگا۔ وہ اب تک کئی
لوگوں سے مل چکی تھی۔ عورتوں کے سامنے تو اس نے اپنی ساڑیوں، بالوں اور میک اپ کے

طور طریقوں کے بارے میں اپنی حیرت انگیز معلومات کا سارا خزانہ لٹا یا ہی تھا، لڑکوں کو فلرٹ کرنے میں بھی اُس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جن میں سے بیشتر اُسے اپنی آفر پر لیے لیے پھرنے لگے تھے۔ دو ایک بار اس نے میرا محنت بھرا مارو بڑی چالاکی سے جھٹک دیا تھا۔ اور اب میں یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ہی اس کا جو بیر یا بوڑھا شوہر ہوں جو۔ چاہتے ہوئے بھی اس کے بار اٹھانے پر مجبور ہو گیا ہو۔

اب وہ بیٹھی رو رہی تھی اور مسز سلوک اس کی دلجوئی کر رہی تھی اور سلوک کہہ رہا تھا "رہنے دو یار، ہم اپنی باتیں جاری رکھیں۔ ٹھہرو، میں اپنی بینک کی پاس بکس اور انشورنس کے کاغذات اٹھا لاؤں۔"

اس کمرے سے جلد ہی سارے لوگ اٹھ کر کہیں اور چل دیئے۔ صرف میں اور سلوک آدھ گھنٹہ اور کاغذات الٹتے پلٹتے رہے لیکن اب میرا جی اس کام میں نہیں لگ رہا تھا یکسوئی کا سارا تسلسل ٹوٹ چکا تھا نہیں لنچ پر ایک وکیل دوست کے یہاں بھی پہنچنا تھا میں نے گھڑی دیکھ کر اجازت چاہی ـــ

برآمدے میں سے گذرتے ہوئے ایک کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا ٹمیٹو اور ندھی ایک کیسٹ لگا کر ناچ رہے تھے

ادھ کھل پیل۔
دی آر پیپل۔
ادھ کھل پیل۔

ٹمیٹو کی بیوی اپنی شیر خوار بچی کو گود میں لیے اسے فیڈنگ بوتل سے دودھ پلا رہی تھی اور اُن کی طرف خاموش مگر مسرور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
میں پیچھے جانے والے راستے کی اور بڑھتے ہوئے بولا "سلوک اُسے کہہ دینا ٹیکسی لیکر خود ہی میرے دوست کی قیام گاہ پر چلی آئے ـــ یا ٹمیٹو ہی اُسے پہنچا دے گا" ۔ ۔ ۔

کھلی آنکھوں کی تصویر

کوئی بھی چیز ٹوٹتی ہے تو کچھ نہ کچھ آواز ضرور پیدا ہوتی ہے، لیکن جب دل ٹوٹتا ہے تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بہت ہوتا ہے تو آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں لیکن اس وقت بیلم پاٹھک کی آنکھوں میں آنسوؤں کا شائبہ تک نہیں موجود تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ خاموش تھی ۔ بے حد خاموش کبھی کبھی پورے معاشرے کا سناٹا ایک ہی چہرے پر اُتر آتا ہے، صرف ایک چہرے پر جیسے ہی وہ اپنے گرد و پیش کا تنہا نمائندہ ہو یا پھر سارے واقعات کا ایک ہی مرکز

وہ اپنے پیچھے ایک بھری پُری کالونی چھوڑ کر چلی آئی تھی، جہاں کے رہنے والے اچانک گونگے ہو گئے تھے اس کے شوہر کے بارے میں کسی کی زباں سے ایک لفظ تک نہیں نکل پایا تھا۔ جو کچھ اچانک ہو گیا تھا، پر انہوں نے اس پر ابھی تک ایک خاموش حیرت کا ہی اظہار کیا تھا۔ اسی لیے اس نے بھی کچھ نہیں کہا تھا کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی تھی بس ان ہی لوگوں کے چہروں کا سناٹا اپنے چہرے پر لگا کر یہاں تک چلتی چلی آئی تھی وہ کچھ سوچ بھی نہیں پا رہی تھی ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس نہ طاقت تھی نہ ہی وقت وہ جلد سے جلد پُرانی بستی کی اس دکان پر پہنچ جانا چاہتی تھی، جہاں کبھی کوئی حادثہ لوڈ شیڈنگ آج تک یہاں نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ سب کو معلوم تھا کہ وہاں کرائے پر کراکری، میزیں، کرسیاں، قنائیں، ٹینٹ وغیرہ ہر چیز مل جاتی ہے اس نے دل ہی دل میں بس

طے کر لیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ گوروماں کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اُسے دیکھتے ہی وہ سب
کچھ سمجھ جائے گا اور پھر اس کے کشٹ دُور ہو جائیں گے اس کی نظروں میں ابھی تک وہی ایک ایسا
آدمی تھا جو چٹکی بجاتے ہی ساری مشکلیں آسان کر دیتا ہے

جب وہ رکشا سے اُتر کر دکان کے سامنے پہنچی تو اُسے ایک اور دھکا لگا وہ پہلے ہی ایک
بہت بڑے صدمہ کا شکار ہو کر وہاں آ رہی تھی اور اب دکان بھی خالی پڑی تھی۔ اندر کوئی نہیں
تھا سوائے سامان کے جو فرش سے لے کر چھت تک بھرا ہوا تھا اور چھت میں بھی اگر کوئی جگہ خالی ہو سکتی تھی
تو وہاں سجاوٹ کے کام آنے والے بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلبوں کے بیشمار گردآلود ہاروں کے بنڈل
لٹکے ہوئے تھے

نیلم پاٹھک نے اِدھر اُدھر جھانکا۔ شاید وہ کسی دوسری دکان کے سامنے کھڑا ہوا کسی کے ساتھ بات
کر رہا ہو یا پان لگوا رہا ہو۔ نیلم نے اکثر اُسے اسی طرح اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے یا گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔
لیکن آج وہ کہیں نہیں تھا جبکہ دوسرے سارے لوگ موجود تھے جو نیلم کو پہچانتے تھے چھوٹے چھوٹے
دکاندار اور سیلز مین اور پٹری کا ہر مال پھیلا کر گاہکوں کی آوازیں دے دے کر بلانے والے لیکن
آج اُنھوں نے اسے پہچان کر بھی بے حد حیرت دکھائی یہ ٹھیک بھی تھا کہ وہ اس طرح حیران ہو اُٹھتے
کیونکہ اب وہ گوروماں کی بیوی نہیں تھی اور وہ وہاں ایک سال کے بعد اچانک دکھائی دے گئی تھی۔
اُن کی تیز نظروں سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے دکان کے اندر چلی گئی۔ وہاں جا کر ایک خالی کرسی
پر بیٹھ گئی

سامنے چھوٹا سا ایک تخت لگا تھا اس پر ایک میلی دری بچھی تھی اور کچھ پرانے رجسٹر اور ایک
اخبار پڑا تھا اور دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر ٹنگی تھی جس پر تازہ پھولوں کا ہار پڑا تھا اور دیوار کے
ایک سوراخ میں بجھی ہوئی اگربتی دکھائی دے رہی تھی ذرا فاصلے پر اسی دیوار میں جہاں سیلنگ فین
کا رنگ آلود ریگولیٹر ایک بورڈ کے ساتھ قریب قریب لٹک رہا تھا بجلی کے ایک پرانے تار کے ساتھ
بندھی ہوئی ایک فوٹو بھی لٹکی ہوئی تھی اس کے دُھندلے شیشے کے پیچھے سے چار دوستوں کے چہرے
جھانک رہے تھے اور وہ سب ہنس رہے تھے۔ ان میں سے ایک گوروماں تھا

یہ سارا کچھ ایک سال پہلے بھی اسی طرح موجود تھا اور شاید اس سے بھی بہت پہلے سے جب وہ

پودوں جیسا ہی ہوتا وہ اُسے باتوں ہی باتوں میں کسی باغ کے تصور میں لے جاتی اور اُسے کہتی ۔۔۔ 'آج ہوا بند ہے آج پھول پودے بھی خاموش ہیں لیکن ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ ابھی ہوا کا جھونکا آئے گا اور یہ ایک دوسرے سے گلے ملنے لگیں گے ہوا ہی اُن کے لیے ایک ساتاتی سچائی ہے جس طرح ہمارے لیے ہمارے جذبات اور ہماری خواہشات ایک حقیقت ہیں کبھی کبھی ہم کچھ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے ہیں اور بے اختیار مسکرا دیتے ہیں

گوروماں ان نوجوانوں میں سے تھا جو گردوپیش کی خوبصورتی اور اس کے اثرات سے بالکل بے خبر ہو کر اپنی عورتوں سے محبت کرتے ہیں جب محبت کرنے پر بالکل مجبور ہو جاتے ہیں تو اچانک انھیں باہر کی بہت سی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔

جیسے عورت کو اپنی گود میں لٹا کر اُسے صرف مسکراتے ہوئے دیکھنا ہی کافی نہیں ہو سکتا یا جب اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو جائے اور گہرائی اور بڑھ جائے یا اس کے چمکیلے نرم نرم بال اچانک کھل کر اس کے چہرے پر آ گریں تو آدمی کو ۔۔ اپنا دل جیسے مٹھی میں بند ہو کر پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے ان لمحوں میں اتنی خوبصورت کیفیت کو بیان کرنے یا صرف محسوس کرنے کے لیے اُسے کچھ دوسری چیزوں کے نام یاد کرنے کی ضرورت پیش آنے لگتی ہے جو اس نے کبھی نہ کبھی کہیں دیکھی ضرور ہوتی ہیں لیکن وہ مناسب تشبیہیں یاد نہ کر پا کر خاموش رہ جاتا ہے اور ٹھگا ٹھگا سا تکتا رہ جاتا ہے

نیلم نے اُسے پہلے درجے کی کاروباری زندگی سے کبھی کبھی نکال کر فطرت کی دنیا سے بھی ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہ گئی تھی اپنے آدمی کے ذہن پر پڑی ہوئی روایتی زندگی کی پرتیں کھرچنا اس کے لیے اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا جتنا وہ سمجھتی تھی اور اُسے یہ تجربہ بہت مہنگا پڑا تھا کہ ایک اوسط درجے کے آدمی کی بیوی ہو کر وہ ذرا اونچی سطح کی باتیں بھی سوچ سکتی تھی جو اس طبقے کی عورتوں کو نہیں سوچنی چاہئیں اس کا سماجی تعلق یقیناً اُس طبقے سے تھا جو گوروماں کا تھا اس کے ماں باپ، بہن بھائی بھی ویسے ہی کچھ تھے جیسا اس کا پتی تھا لیکن وہ خود کو ان سب سے الگ بھی سمجھتی تھی اپنے گھر میں بھی جہاں اس نے پچیس سال تک پرورش پائی تھی اس نے زندگی کو زندہ رہنے کا ایک ولولہ محض تصور کیا تھا۔ جیسے سانس لینے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، جیسے زیادہ سے

زیادہ جانے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ تمام تر پاکیزگی اور سادگی کے ساتھ اگر محض اس
کے تصورات کی دنیا تھی تو تھی، اس پر اُسے کبھی شک نہیں ہوا تھا اگر وہ پرچھائیاں دیکھنے کی عادی ہو گئی
تھی تو وہ اس حقیقت سے انکار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سچ مچ آنکھیں بند کر کے گھنٹوں بے شمار
رنگ دیکھ سکتی تھی ایک دوسرے میں گھلتے ملتے ہوئے اور اس عمل میں وہ اُن کا سنگیت بھی سُن
سکتی تھی۔ اور یہ تصور بھی کر سکتی تھی کہ اُس کا کوئی ایک محبوب بھی یقیناً ہے۔ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟
اس سے اسے کوئی غرض نہیں تھی اس کے لیے اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے،
یا شادی شدہ یا اس سے بھی بدتر حالات میں رہنے والا جس انداز سے وہ خود زندہ ہے، اسی قسم کی
اس کی بھی ایک اپنی زندگی ہوگی اور اسی طرح بے حد سادہ اور صاف ہوگی

یہ تجسس کا ایک سلسلہ تھا جو ہر دن ہر رات اس کے سامنے ایک اَن دیکھا راستہ سا بناتا چلا
جاتا تھا۔ اس نے اس کے دل میں اپنے گھر والوں کے لیے محبت کی کمی واقع نہیں رہی تھی وہ اب بھی
انہیں پہلے کی طرح چاہتی تھی اپنی دونوں بہنوں سے تو اُس نے بڑی شدت سے پیار کیا تھا اگرچہ
اُسے دوسری قسم کی حد بندیت میں مبتلا کر دیتی تھیں کیونکہ وہ خود ہی اپنی اپنی پسند کے مردوں کے
پاس چلی گئیں تھیں وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو گئی تھیں اس لیے نیلم کبھی کبھی اچانک اپنے
آدمی کی موجودگی کی خواہش میں مبتلا ہو جاتی تھی ایسی لمحوں میں لیکن اس خواہش کی تکمیل ناممکن
ہو جاتی تو اُسے صدمہ سا محسوس ہوتا۔

آخر ایک دن جب وہ ہسپتال کی ڈیوٹی ختم کر کے باہر آنے لگی تو اچانک وہاں گوردواں آ گیا۔
اس کے ساتھ بیس تیس آدمی اور بھی تھے۔ ایک آدمی کے سر سے خون بہہ رہا تھا، اور ایک اور آدمی کو
انہوں نے پکڑ رکھا تھا

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟" گوردواں نے جیسے اس کا راستہ روک کر کہا تھا "اس آدمی
کے زخم پر ٹانکے لگوانا ہیں اور بس پولیس کو بلوانا ہے"

اس نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا پھر اُس آدمی کا زخم صاف کیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے اُس کے
ٹانکے لگا کر اس کے سر پر پٹی باندھنے کا کام نیلم کو سونپ دیا تھا جس کی نگرانی گوردواں ایک انتہائی
انداز سے۔ پاس کھڑے ہو کر کر رہا تھا۔ اُسے یہ بھی مار رہا تھا کہ بس ڈرائیور کی جلد بازی

کی وجہ سے اس آدمی کو اتنی چوٹ آئی ہے لیکن اس نے ڈرائیور سے کچھ روپے لے کر اُسے پولیس
کے ہاتھوں میں نہیں جانے دیا تھا زخمی اور بس کے مشتعل لوگوں کو سمجھا بجھا کر اس نے واپس کر دیا تھا
نیلم کو وہ آدمی حیرتناک حد تک کاروباری لیکن متاثر کرنے والا لگا تھا۔۔۔ وہ اس کی محبت میں
اسی لیے گرفتار ہو گئی تھی اور پھر اسی آدمی کی زندگی میں اپنے تمام تر حوالوں کے ساتھ داخل ہو گئی تھی۔

خالی دکان میں دیر تک تنہا بیٹھے بیٹھے نیلم پاٹھک اچانک پریشان سی ہو اٹھی گور وہاں ابھی
تک واپس نہیں آیا تھا وہ نہیں جانتی تھی وہ کہاں چلا گیا تھا لیکن وہ اس کے انتظار میں بیٹھی رہی
اور سوچتی رہی۔۔۔ زندگی اتنا ہیجانی لمحہ کیوں ہوتا ہے یا وہ یہ کیوں سمجھتی ہے کہ اُسے ایسا ہی ہونا
چاہئے۔ سریندر پاٹھک بھی اسی طرح زندگی میں اسی طرح اچانک ہی آ گیا تھا۔ جب اس نے فیصلہ
کر لیا تھا کہ اسی کو آنا چاہیے وہ دوسرے درجے کا کاروباری شخص نہیں تھا ایک آفس میں سپرنٹنڈنٹ
تھا جسے کسی ادھیڑ یا بیوہ عورت کی تلاش تھی جو اس کے دو نوعمر بچوں کی ماں اور اس کی بیوی بن سکے
خالص گھریلو قسم کی بیوی عمر کی قید چالیس تک تھی ذات پات کی ہرگز نہیں جیسا کہ اُس نے
اشتہار میں دیا تھا وہ گور وہاں سے فارغ خطی لے کر اسپتال کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں تنہا رہ رہی تھی
اسپتال کے ڈاکٹروں اور ڈسپنسروں کے ساتھ دوستی گانٹھ لینا اُسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا بھرتی ہو کر
آنے والے مریضوں یا اُن سے ملنے کے لیے آنے جانے والے لوگوں میں اس کی دلچسپی ضرور تھی اُن
کے ساتھ ذرا سی ہمدردی جتا کر وہ انہیں فوراً قریب کر لیتی تھی۔ پھر جب وہ اچھے ہو کر چلے جاتے تھے،
تو وہ اداس ہو جاتی تھی پہلے کی طرح تنہا اور اپنی سوچوں میں غلطاں اسی طرح ایک روز سریندر
پاٹھک بھی اپنی کڈنی کا آپریشن کرانے آ گیا تھا کئی روز تک اسی وارڈ میں رہا، جہاں نیلم کی ڈیوٹی
رہتی تھی وہیں بیڈ پر لیٹے لیٹے سریندر پاٹھک نے اُسے اخبار میں چھپوایا ہوا اپنا اشتہار اور ڈاک
میں ضرورت مند عورتوں کے خطوط دکھائے تھے وہ چاہتا تھا نیلم اس کے لیے بیوی کے انتخاب میں
اس کی مدد کرے وہ اس کے ساتھ ہر عورت کے کردار اور ماحول کے بارے میں گھنٹوں بحث کیا
کرتا تھا اُن کے خطوط میں بین السطور حقائق تلاش کرنے میں لگا رہتا تھا کچھ عورتوں نے تو فوٹو بھی بھجوا
دیئے تھے لیکن وہ اپنے لیے دوسری بیوی کا انتخاب کرنے میں خود کو جانے بے بس پاتا تھا کیونکہ اس
کی پہلی بیوی اس پر گہرے اثرات چھوڑ کر مری تھی اس کی کئی باتوں کا ذکر وہ بڑے جذباتی انداز

میں کرتا رہتا تھا۔ نیلم سمجھتی تھی سبھی امیدوار عورتوں کو اس کی حیثیت کا علم تو تھا لیکن اس کی دبی گانٹھوں کا ہرگز نہیں۔ ایسی کوئی بھی گانٹھ کھولنے کے لیے بڑے صبر اور توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیلم نے دیکھا کہ وہ ایک ایسی خطرناک آنے والی چٹان کی طرف بڑھتا جا رہا ہے جو اس کی زندگی کی کشتی کو اچانک پاش پاش کر دے گی۔ کوئی بھی عورت اتنی آسان اور بے غرض ہرگز نہیں ہوتی کہ خود کو بھول کر اپنے آپ کو مرد پر قربان کر دے خاص کر ایسے مرد پر جو پہلی بیوی کو ہڑپ کر چکا ہو اس کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اپنے تعصبات اور نظریات بھی جن سے وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔

ایک دن اچانک اس نے اپنا خط ڈاک کے ذریعے سریندر پاٹھک کے پاس بھجوا دیا تھا۔ جس وقت سریندر اس کا خط پڑھ رہا تھا وہ ذرا فاصلے پر ایک اور مریض کو انجکشن لگا رہی تھی سریندر نے سر گھما کر اس کی طرف بڑی حسرت سے تاکا تھا جب وہ اُسے انجکشن لگانے کے لیے اس کے پاس گئی تو دونوں مسکرا رہے تھے دونوں بہت خوش بھی تھے۔

سریندر پاٹھک کی زندگی اس کی توقع کے خلاف بہت زیادہ پیچیدہ نکلی وہ اس کے دونوں بچوں کو اپنے سے بہت قریب کر لینا چاہتی تھی لیکن اس راہ میں اس کا باپ ہی ایک رکاوٹ بن گیا۔ وہ سمجھتا تھا نیلم اُسے اتنی محبت نہیں دے سکے گی اگر وہ بچوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنے شوہر پر اپنی تمام تر محبت کا خزانہ لٹا دینا چاہا تو وہ اس وہم کا شکار ہو گیا کہ وہ اُس سے اس کی پہلی بیوی کی ساری یادیں ہی چھین لینے کے لیے ایسا کر رہی ہے نیلم نے کبھی کبھی مایوس ہو کر سرد مہری کا رویہ اپنا لیا تو وہ یہ بحث لے کر بیٹھ گیا کہ نرس پیشہ عورتیں اپنی دلکشی اور دلچسپی کا بہت سا حصہ باہر لٹا کر گھر لوٹتی ہیں وہ اُسے بیس روز تک اسپتال میں مریضوں اور ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا

نیلم اُسے مطمئن رکھنے کے لیے اپنی ملازمت تک چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن وہ سریندر سے بھی ایک ضمانت چاہتی تھی کہ وہ بھی گھر سے بہت زیادہ دیر تک بے وجہ باہر نہ رہا کرے لیکن میاں بیوی کے درمیان یہ ڈائیلاگ جو کئی روز سے چل رہا تھا کے دوران ایک واقعہ اور ہو گیا اُن کے پڑوس میں رہنے والی تیرہ برس کی ایک کمسن لڑکی کے باپ کی شکایت پر پولیس سریندر پاٹھک

کو پکڑ کر لے گئی تھی۔

اچانک گورو ماں اپنے لمبے لمبے بازو آگے پیچھے جھلاتا ہوا اندر آ گیا اپنی دکان کے اندر نیلم کو سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹک تو گیا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر وہ اپنی فطری بے تکلفی سے بولا۔ "بڑی مصیبت ہے ایک تو لوگوں کا کام کراؤ اس پر شکایت بھی سو کہیں بیچ میں اپنا کمیشن کھا گیا کل سامنے سڑک پر ایک کار والے نے ایک غریب راہ گیر کو کچل دیا تھا اتفاق سے میں سامنے سے آ رہا تھا دونوں بازو پھیلا کر میں اس کے سامنے تن گیا ورنہ سالا اپنی کار بھگا کر نکلا ہی جا رہا تھا۔"

نیلم نے دیکھا گورو ماں ابھی تک اس کے سامنے اپنے بازو پھیلائے ہوئے کھڑا ہے، اور اس کے بازو اتنے لمبے ہیں کہ اس وقت اگر وہ بھی گھبرا کر یہاں سے نکل بھاگنا چاہے تو وہ اسے ایسا نہیں کرنے دے گا وہ اس کی آنکھوں میں سیدھے دیکھتا ہوا ہنس بھی رہا تھا

"پھر کیا ہوا کہ میں نے اسی کی کار میں زخمی کو ڈالا اور فوراً اسپتال لے چلنے کا آرڈر دیا وہ ملاچوں وچراں اِدھر کو ہو لیا وہاں سے میں اسے تھانے لے گیا تھانیدار نے دو ہزار مانگے۔ میں نے کہہ سُن کر اٹھارہ سو میں فیصلہ کرا دیا اب وہ کہتا ہے میں نے بیچ میں اپنے بھی پانچ سو مار لیے اسے تو مجھے الگ سے پانچ سو روپے انعام کے دینے چاہییں تھے۔ ورنہ کچہری کے چکر کاٹتے کاٹتے بچو کی ایڑیاں ہی گھِس جاتیں!"

نیلم نے دیکھا، اب وہ پلٹ کر دیوی کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے بتی اگر بتی بھی سلگائی ہے اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھ رہا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا کہے گورو ماں نے خود ابھی تک اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا ہے۔ وہ اپنے پتی کو حوالات سے چھڑا لے آنے کے لیے اپنے پرس میں پانچ ہزار روپے رکھ کر لے آئی ہے لیکن اچانک اُس کی ہمت جواب دے گئی گورو ماں کو اپنی بپتا کیسے بتائے وہ سنے گا تو اس کے منہ پر طمانچہ نہیں مار دے گا کہ اُسے چھوڑ کر کسی اور آدمی کو اپنا مالیا تھا۔۔۔ وہ اس کا حصہ جانتی تھی وہ اسی قابل ہے بھی کہ اُسے اسی طرح بے عزت کیا جائے

اُس نے اپنے اندر ایک ناقابلِ برداشت اذیت سی محسوس کی ایسی تکلیف کہ اس کے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور وہ سسکنے لگی۔

گورو ماں نے دیوی کے سامنے سر کو جھکائے جھکائے حیران سا ہو کر پلٹ کر دیکھا لیکن، ا۔۔

کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ سلیمہ خود ہی پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی بولی ــــ " میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ پولیس کے قبضے سے باہر نہ آسکے ــــ اندر ہی پڑا سڑتا رہے۔ ایسے آدمی کے ساتھ اب میں کبھی نہیں رہ سکوں گی۔"

گورو ماں کئی لمحوں تک اس کی طرف بڑی خاموشی سے دیکھتا رہا پھر جیسے اپنے آپ ہی کچھ سوچ کر بولا ــــ " جو کچھ تم سوچ رہی ہو وہ ایک اور بڑی بیوقوفی ہوگی تم سمجھتی ہو ایسا کر کے تم اپنے دُکھ سے نجات پا لوگی؟ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ اس کی سزا بھی وہ ضرور بھگتے گا چلو اٹھو۔ وہ کوں سے تھانے میں ہے؟ اور ہاں تم کچھ روپے لے کر آئی ہو یا میں اپنے پاس سے لے کر چلوں؟"

ایک اور اگنی پریکشا

دروازہ کھلتا ہے۔

چار لوگ اندر آتے ہیں۔ میرے والد، میرے سسر، اُن کے سالے صاحب اور سب کے آخر میں میری بیوی سیتا جو دہلیز کو پار کرتے کرتے اچانک وہیں رُکی سی رہ جاتی ہے۔

میں اُسے بس ایک اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھ پاتا ہوں۔ اُس کے فوراً بعد دوسرے لوگوں کی ت ... سوں جو میرے سا ... ہم دائرہ سا بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں

... کی گنتی ...

حاشیہ ... ہیں، ... تھوکنے کی طرح ماضی کی تہ میں

دونو ... یں آ تر کر اپنی بیوی کی لاش کو

... لے بالوں سے بھرا ہوا سر ساڑی کے

... جو دو ... گھر چھوڑ

وقت ا ... کی سمی

بیٹھے۔

انھیں اپنی ساری کہانی کا بہت افسوس ہے۔"

سیتا کے والد الفاظ ٹٹولتے ہوئے مخاطب ہوتے ہیں "میرے سامنے تم میری بیٹی سے کوئی بھی قسم کھانے کے لئے کہہ سکتے ہو میں کہتا ہوں یہ ستی ساوتری ہے۔ اپنے نام کی طرح پوتر ہے۔"

اس کے ماما جی سرکھا کر اُسے پکارتے ہیں۔ "اندر آجاؤ سیتا!"

میں دیکھتا ہوں کہ سیتا صرف ایک پاؤں دہلیز کے اندر رکھ پاتی ہے۔ اس کا دوسرا پاؤں باہر ہی ٹکا رہ جاتا ہے۔

"بیٹھے!" میں اُن کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف ہو جاتا ہوں۔ صوفے اور کرسیاں بھی جیسے محو انتظار ہو جاتی ہیں۔ جانی، خاموش اور ملتجی۔

چند لمحے اور گزر جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کوئی بھی نہیں بیٹھنا چاہتا۔ سیتا کے ماما جی حالات معمول پر لانے کی خاطر موڈ میں آ کر کہہ اُٹھتے ہیں۔ "نہیں، ہم لوگ اب چلیں گے آپ کی امانت آپ کے حوالے کئے جاتے ہیں۔"

ان کے پیچھے پیچھے میرے سسر بھی باہر نکل جاتے ہیں۔ اور پھر میرے والد بھی جانے سے پہلے وہ اپنی بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دے دیتے ہیں سیتا پہلے کی طرح دہلیز پر چوکھٹ کے ساتھ لگی ہوئی سی کھڑی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے کیا کہوں۔ میں اس بات کو بھول چکا ہوں کہ اس کے والدین اور دوسرے سگے سمبندھی میرے بارے میں کیا کیا کہتے رہے تھے کچھ باتیں اس لئے بھی کہی جاتی ہیں کہ بارک ترین رشتوں کی پاکیزگی کا اس سے بہتر طریقے سے انتقام لیا ممکن نہیں ہوتا۔

ایسا لگ رہا ہے ہم اسی طرح ہمیشہ کھڑے رہ جائیں گے۔ آمنے سامنے ایک دوسرے کی اور دیکھتے ہوئے۔ سیتا کی آنکھوں میں آج کاجل کی ریکھائیں دکھائی دیتیں اس کے ہونٹوں کی لالی بھی غائب ہے۔ صرف ماتھے پر سندور چمک رہی ہے۔ اور مانگ میں ہلکی سی سیندور کی جھلک ہے۔ دو سال کی علیحدگی نے اسے اداس تو بنا رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پہلے کی طرح پر کشش ہے۔ میں اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتا سا رہ جاتا ہوں۔

اچانک کہیں دور مکان میں لگا ہوا لاؤڈ اسپیکر آن ہو جاتا ہے اور کچھ لوگوں کی رامائن کا اجتماعی پاٹھ کرنے کی اونچی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔

ہوں ہو کہاوت اشوکھٹ، رام سہت آیہاس
صاحب سیتا ساتھ سو، سوک تلسی داس

میں کھڑکی بند کرنے کے لئے چل پڑتا ہوں لیکن وہاں پہنچ کر کھڑا سا رہ جاتا ہوں۔ کیونکہ اب میری نظروں کے سامنے وہ نہیں ہے ملکہ واریکے کی لکھی ہوئی تاریخ کے پھڑپھڑاتے ہوئے پنے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اس کے چہرے پر لگی دو آنکھوں کے علاوہ اور بھی کئی آنکھیں کھل گئی ہیں۔

سیتا۔ سوئمبر سبھا میں آنے سے پہلے ہی رام کو دل دے بیٹھی تھی۔

جب رام۔ طاقت آزمائی کے لئے ستودھنش کی طرف بڑھ رہا تھا تو سیتا من ہی من میں پرارتھنا کر رہی تھی کہ اسے سارے دیوتاؤں کی شکتی حاصل ہو جائے۔

سیتا نے۔ رام کو جنک پوری میں گھومتے دیکھ کر اپنی ایک سکھی سے کہا تھا کہ وہ رام کے پاس جا کر اسے سوئمبر میں آنے کے لئے کہے۔

بھاری ستودھنش کو اٹھا کر چلّہ چڑھانے کی طاقت لچھمن میں تھی۔ لیکن وہ اپنے بڑے بھائی کے حق میں دستبردار ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

رام اور سیتا کا وواہ بن باس کے دوران ہوا تھا۔

میرے پاس اس کے لکھے چار خط ابھی تک موجود ہیں۔ جو اس نے سوربھ کے ذریعے بھوائے تھے۔ سوربھ اور وہ سوشیالوجی کے فائنل ایئر میں ساتھی تھے۔ سوربھ نے اچانک تعلیم ادھوری چھوڑ کر انفارمیشن کے محکمے میں سروس کرلی تھی اور ایک دوسرے شہر میں چلا گیا تھا۔ ہماری شادی کے دوران اس کا مبارکباد کا تار آ گیا تھا۔ جسے دیکھ کر پتا جی نے بڑے غصے میں آ کر کہا تھا "ایسی سروس بھی کس کام کی، جو انسان کو اپنے بڑے بھائی کی خوشیوں میں شریک ہونے سے روک رہے"

اس نے میری زندگی سنوارنے کے لئے بہت اچھا ساتھ دیا تھا سب ہی تو تھے

سے عرصے میں مجھے تیں مار ٹرالسفر کیا گیا تھا۔ اُس نے ہر جگہ میرا گھر نئے سرے سے سجا دیا تھا اور مجھے کہیں بھی نئے دوستوں کی کمی نہیں محسوس ہونے دی تھی لیکن وہ سورج کی کمی ہر جگہ محسوس کرتی رہی تھی۔ کہتی تھی چلو، اُس کے پاس جا کر اُسے منائیں۔ اس کے اصرار پر میں نے دو بار چھٹی لی تھی جسے بعد میں کینسل کرا دیا تھا۔

عورت کے دل میں کئی گوشے ہوتے ہیں۔ وہ ہر کسی کو ایک نہ ایک گوشے میں بسائے رہتی ہے ایک بیوی کی طرح، ایک بہن کی طرح، ایک بیٹی کی طرح، ایک اچھی دوست کی طرح بھی۔ لیکن پتہ نہیں چلتا اس کے دل کا کون سا گوشہ کس کے لئے زیادہ نرم اور کشادہ ہے۔

ایک شام کا قصہ ـــــ

"سیتا تمہاری محبت نے مجھے اپنے چھوٹے بھائی سے بہت دُور کر دیا ہے۔"

اُس کا جواب تھا۔ "تم میری آنکھوں میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھتے لیکن میں جب بھی تمہاری طرف دیکھتی ہوں، تم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہو۔"

"پھر بھی پتہ نہیں کیوں، ایک عجیب سا خوف جکڑے رہتا ہے۔"

"یہ بھی تو یاد رکھا کرو کہ ہمیں ملانے والا سورج ہی تھا۔" وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑی تھی۔

بس وہی ایک قہقہہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مجھے زخمی کر گیا تھا۔

مجھے پھر سے ہمدردی کا عطیہ دینے کے لئے میرے آس پاس کوئی ہوا کا بیٹا نہیں تھا جو سینکڑوں کوس پرواز کر کے پورا پہاڑ ہی اٹھا کر لے آتا۔

ایک دن سیتا نے خود ہی تار دے کر سورج کو بلایا تھا۔ ہم تینوں نے ایک جگہ جمع ہو کر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی نے میرے قدموں پر ایمان رکھ کر قسم کھائی تھی۔ میرے سینے سے وہ پھانس نہیں نکل سکی تھی میں دو سال تک تنہا بھٹکتا پھرا تھا۔ انسان کی اپنی سوچیں بہت دشوار گزار جنگل بن جاتی ہیں۔ آدمی ان پر پردہ ڈالنے کے لئے تپسیا کرتا ہے۔ میں نے بھی کی۔ لیکن وہ ہر کہیں تھی۔

کبھی میرے پیچھے پیچھے کبھی آگے آگے۔ کانٹوں اور جھاڑیوں سے اُلجھتی ہوئی گرے مایوں اور دلدلوں کو پار کرتی اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلتی ہوئی میں اُسے دیکھ سکتا تھا۔ کبھی سر گھما کر کبھی اپنے اندر ڈوب کر۔

"سُنیے!" میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ اب چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی نہیں ملتی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں۔ دور تک دیکھ آتا ہوں وہ کہیں نہیں ہے کہیں واپس نہ چلی گئی ہو۔ میں مایوس ہو کر اسی چوکھٹ کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور کئی لمحوں تک اسی طرح سکتے کے عالم میں ایستادہ رہتا ہوں اچانک میرے کان ایک آہٹ سنتے ہیں۔ میں اسی آہٹ کی تلاش میں ہر کمرے میں جاتا ہوں کچن کا دروازہ کھلا ہوا ملتا ہے اندر سے مٹی کا تیل جلنے کی بدبو آرہی ہے۔ میرے قدم دروازے پر رُک کے رہ جاتے ہیں۔ وہ اسٹوو میں پمپ مارتی ہوئی پلٹ کر دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب پہلی سی شکایت نہیں ہے وہاں دُور دُور تک ایک نشیلی مُسکراہٹ کی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اسٹوو کے ر رے چاروں طرف اٹھتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لپٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہتی ہے "اگر میں سچی ہوں تو میرا ہاتھ ہرگز نہیں جلے گا۔ لیکن اچھا ہوگا، تم ہی میرا ہاتھ پکڑ کر آگ میں لے جاؤ۔ لو پکڑو!"

میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ان لپٹوں کی طرف حیرت سے دیکھنے لگتا ہوں

+

ایک جام لاہور کے نام

یہ بات پورے وثوق سے کبھی نہیں کہی جا سکتی کہ کون سی جوان و خوبصورت عورت اپنے بڑھاپے میں بھی اتنی ہی تندرست اور دلکش نظر آئے گی۔

کئی برس ہوئے ایک دن اچانک حیات اللہ انصاری اور اُن کی بیگم نے کہلا بھیجا تھا ــــ "آج ہمارے یہاں چلے آئیے۔ آپ کی ملاقات اُردو کی ایک مشہور ادیبہ سے بھی کرائی جائے گی۔"

جب وہاں گیا تو قرۃ العین حیدر اپنے بیشمار مداحوں میں گھری ہوئی بیٹھی تھی۔ تعجب اس لیے بس ہوا تھا کہ اُن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی بلکہ اُن کی چھپی ہوئی تصویر کے عین مطابق اُنھیں دلکش پایا۔ میں نے دل ہی دل میں پیشین گوئی کی تھی ــــ کہ وہ تاحیات ایسی ہی "گلیمرس" رہیں گی۔ شاید میرے اس تصور کا سبب علیٰ کی نظری پرستگی اور خوش مزاجی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ لیکن جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں۔ اُس کا تعلق قرۃ العین حیدر سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک اور حیرت ناک واقعہ ہے جو چند گھنٹوں کے بعد مجھے پیش آیا تھا۔

اُسی روز سہ پہر کو بھوپال میل سے میرا ریزرویشن تھا۔ جب میں کمپارٹمنٹ میں گیا تو وہاں ایک ایسی سادہ چہرے والی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ جس کی شکل ہو بہو علیٰ جیسی تھی۔ شلوار قمیص کے اوپر دوپٹہ اوڑھے، پیچھے کے ایک برتھ پر لیٹے ہوئے پندرہ سولہ برس کے ایک نوعمر لڑکے کے سر کے نیچے تکیہ ٹھیک کر رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا اور کہا ــــ "آؤ جی۔ پر ذرا ٹھہر جاؤ۔ آپ کے برتھ پر سے میں اپنی چیزیں سمیٹ لوں۔"

ایک تیز احساس اور نہایت ہی شیریں آواز اور تیر کی مانند سیدھے دل میں اُترتا ہوا اس کا ٹھیٹھ پنجابی لہجہ! لیکن میں یقین نہ کر سکا کہ قرۃ العین حیدر نے اس قدر آناً فاناً اپنی عمر کی اتنی طویل مسافت طے کر لی ہے! وہ عورت اس سے یقیناً دس پندرہ سال بڑی تھی اور اُس کے بال بالکل سفید اور روکھے تھے، جو ایک چھوٹے سے جوڑے میں سمٹے ہوئے تھے ادھر اُدھر سے کھلی ہوئی لٹیں اس کے تروتازہ چہرے کے آس پاس جھول رہی تھیں

اُس نے ہاتھ بڑھا کر میلے تولیے، کیسہ اور چادر اُٹھا لینی چاہی تو میں نے اُسے روک دیا — "پڑا رہنے دیجیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے"

میں اپنا سامان ایک طرف رکھوا کر برتھ کے ایک کونے پر ٹک گیا اُن کا سامان اُوپر کے دونوں برتھوں پر بھی بڑی بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا اُس نے میری طرف پھر مسکرا کر دیکھا اُس کی مسکراہٹ میں تشکر کی بھی ایک جھلک تھی جس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی پھر بھی اس نعمت کو میں نے اپنے سفر کے آغاز کے لیے ایک نیک شگون سمجھا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوا

اب وہ کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ اپنا چہرہ چپکائے کسی کو پکار رہی تھی — "ہن آ دی جاؤ — ! گڈی چل دے گی، میں نے کہا"

جینی لکھنؤ کے لہجے میں جتنی اچھی اُردو بولتی ہے، ویسی ہی روانی سے وہ اپنی مادری زبان میں بول رہی تھی میری نظر پلیٹ فارم پر کھڑے ایک ادھیڑ عمر مرد پر پڑی جو نل پر منہ ہاتھ دھو کر اب تولیے سے اپنی گیلی ہوئی داڑھی مَل مَل کر پونچھ رہا تھا اس کے سر پر کیسری رنگ کا ایک پٹکا بندھا ہوا تھا اپنی بیوی کی آواز سن کر وہ کھڑکی کے پاس چلا آیا بڑی نرم مگر بھاری گھن گرج سے پوچھنے لگا — "کی گل اے جینی! کچھ لینا ہے؟ سیب بڑے اچھے مل رہے ہیں لے لوں؟"

"لے لو۔"

اُن کے درمیان جو مختصر سی گفتگو ہوئی اس کے صرف ایک لفظ نے مجھے مزید حیرت میں مبتلا کیا اس عورت کا نام جینی ہے — میرا جی چاہا اپنی آنکھیں مل مل کر اُس کی طرف پھر دیکھوں۔ کہ وہ سچ مچ قرۃ العین حیدر تو نہیں ہے

اس کا شوہر چند منٹ کے بعد بہت سے سیب اور کیلے لئے ہوئے اندر آگیا لوٹتا ہوا —

"واہ جی واہ! بڑے شاندار سیل مل گئے۔ مزہ آگیا!"

اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ قدرے درست لہجے میں پوچھنے لگا ــــ "آپ کو اسی کمپارٹمنٹ میں جگہ دی گئی ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں اُسے جواب دیتا، تین یار اسٹوڈنٹ دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ اُن پر وہ بُری طرح برس پڑا ــــ "یہاں کہاں گھسے چلے آرہے ہو؟ ہمارا ریزرویشن پہلے سے ہے۔ دیکھتے نہیں سارے برتھ لگی ہیں! چلو نکلو ــــ کہیں اور جا کے مرو!"

لڑکے شریف تھے یا پھر اُس کے رعب میں آگئے تھے کہ اپنی اپنی کتابیں اور کاپیاں اُٹھائے آگے بڑھ گئے ورنہ وہ عام طور پر کسی کی نہیں سنتے۔ دو ایک اسٹیشنوں تک سمت کا ہی کا تسلسل پورا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بڑی ڈھٹائی سے ہنستے یا چڑاتے ہوئے اور ایک آدھ گالی بھی دیتے ہوئے اپنی منزل پر اتر کر چل دیتے ہیں، لیکن مجھے ایسا لگا، یہ سردار اپنی بیوی سے جاما مختلف واقع ہوا ہے۔ اب دیکھنا ہوگا کہ یہ ساتھ میرا راستہ کیسے کٹتا ہے!

گاڑی چل پڑی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تو وہ قدرے پُرسکون نظر آیا۔ کرتے کرتے ہی اس نے اپنی داڑھی سمیٹی، اور پھر اپنی بکھری ہوئی چیزیں ایک طرف سرکا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ بولا ــــ "معاف کرنا جی، ہم آپ ہی کے برتھ پر بیٹھے ہیں اور اس پر قبضہ چھوڑنے کا بھی ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہاں میری وائف لیٹے گی۔ بڑی مجبوری ہے جی۔ آپ ہی ذرا تکلیف کر کے اُوپر چلے جانا۔"

یہ کہہ کر اس نے ہنسنے کی کوشش بھی کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کبھی آپ، کبھی تم کہہ کر بات کرنے سے اس کے جذباتی ہونے کا بھی پتہ چل رہا تھا اور جس اعتماد سے اس نے میرے برتھ پر قبضہ جمائے رکھنے کی بات کہی تھی وہ اُس نے اپنی بیوی کے لیے طلب نہ کیا ہوتا تو میں صاف انکار کر دیتا۔ پھر بھی اس نے ماحول میں جو تناؤ پیدا کر دیا تھا اُسے خوشگوار بنانے کے لیے میں نے کہا ــــ "نے شک، ڈٹے رہیے، سردار جی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اچھا جی!" شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس نے حیرت کا اظہار کیا اور پھر خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا ــــ "مل گیا! دیکھا! میں نہ کہتا تھا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا ــــ "آپ جی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں؟ ہاں گاڑی

میں تو لکھنؤ سے جڑے ہیں، لکھنؤ والوں کا بھی جواب نہیں۔ واہ جی واہ! ہمیں بھی لکھنؤ کے بارے میں فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں اور کوئی فلم دیکھوں نہ دیکھوں، لکھنؤ والی فلم ضرور دیکھتا ہوں۔ واہ جی واہ!"
اپنی بیوی کی طرف سر گھما کر بولا "سنتی ہیں، ہمارا دوست لکھنؤ والا پڑوسی ہے۔ سریواستو کیسی اچھی باتیں کرتا ہے۔"

اس کی بیوی ہنستی ہوئی بولی "یہ اپنے آپ پہلے آپ کرنا تو جیسے وہ کبھی بھولتا ہی نہیں۔ اسے جھینک کی عادت ہو تو یہی چاہتا ہے کہ پہل ہم ہی کریں۔" بیوی کی کھنکتی ہوئی ہنسی دیر تک میرے دل و دماغ میں گونجتی رہی۔ پھر وہ اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی ۔۔۔ "مسٹر سریواستو ہیں کتنے بیٹھے لکھنؤ والوں کے سامنے ہیں۔"
"اوجی، درجنوں، میں کہتا ہوں درجنوں۔" دونوں کو بے ساختہ ہنستا دیکھ کر مجھے ایسا لگا، جیسے گھر کے اندر ساری فضا خوشگوار ہو گئی ہے جیسا کہ میں چاہتا تھا۔
"لیجیے شاہ صاحب کچھ کھائیے اور یہ سیب بھی۔"
"نہیں آپ ہی کھا لیجیے۔ شکریہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"اجی تکلف مت کیجیے یہاں۔ میں سمجھ گیا آپ اصلی لکھنؤ کے ہیں۔ لیکن ہم تو اس میں یقین رکھتے ہیں کہ دانے دانے پر لکھا رہتا ہے کھانے والے کا نام۔ بیوی ذرا ان کو وہ واقعہ تو سنانا پچھلے سال والا۔"
اب میں نے دوسری بیوی کی حیثیت قبول کر لی تھی اور ایک خاص قسم کی خوشی میں سرشار ہو کر اسے سیب کاٹ کاٹ کر ایک پلیٹ میں رکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
وہ ہنستے ہنستے بتانے لگی۔ "پارسال انھوں نے ایک سرکاری افسر کی دعوت کی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے ہمارے یہاں آنا منظور کیا تھا یا یا آیا تھا۔ اس لیے ہمارے یہاں آنے سے وہ گھبرا رہا تھا جیسی۔ میں نے اس کے لیے بڑے چاؤ سے مرغا بنایا، پلاؤ، خالص دیسی گھی میں سوجی کا کڑاہ پرشاد اور بھی بہت کچھ تھا۔ پر عین وقت پر اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ فون کر دیا، طبیعت خراب ہو گئی ہے اچانک۔ تو جی یہ تو بڑے مایوس ہوئے۔ انھیں لے آنے کے لیے خود ہی گاڑی لے کر چلے گئے۔ پھر بھی وہی مایوسی لینی پڑی۔ منہ لٹکائے ہوئے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ڈرائنگ روم میں ان کا ایک پرانا یار دوست آیا بیٹھا ہے ان کے ساتھ ٹھیکیداری کے معاملوں میں کوئی پرانا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس دن وہ بالکل اچانک صلح صفائی کرنے آ گیا تھا جیسی۔ صلح ہو بھی گئی اور میرا کھانا ایک یار ہی کا سارتھک ہو گیا۔ یہ بھی بہت زیادہ خوش،

اسی کے سامنے کیسے لگے۔ "آج کے کھانے پر صرف ہمارے پارٹنر کے نام کی مہر لگی تھی تو اُسے کوئی دوسرا کیسے کھا سکتا تھا"

سردار جی نے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ "اوہ ۔۔۔ اور وہ ٹیچر بہنوں کا قصہ! وہ بھی تو سنا دے وا اِن کو وہ بھی بڑا دلچسپ ہے جی!"

"ہاں جی، وہ بھی سُن لو جی۔ ہماری کالونی میں دو ٹیچر بہنیں رہتی ہیں بڑی اچھی ہیں بیچاری۔ ماں نے بہت ہی پیار سے پالا لیکن بدقسمتی سے دونوں کی شادی نہیں ہو پائی۔ چالیس پینتالیس پچاس سال کی ہو گئی ہیں۔ اپنے یہاں عید بقر عید پر نہیں مرد بلا لیتی ہیں۔ یہ اُن کا پیار دستور ہے ہمارے ساتھ ایک بار ہم ہی لوگوں نے انہیں انوائیٹ کر لیا۔ بہت کہتی رہیں 'یہ تو ہمارا تہوار ہے۔ آپ ہی لوگ آئیے ہمیشہ کی طرح' لیکن ہم نے بھی ضد کر لی 'اس بار عید ہمارے ہی یہاں منائی جائے گی۔' اس میں ہونا ہی کیا ہے؟ سویاں اور کھانے ہی تو بنانے ہوتے ہیں وہ سب سارا میں بھی جانتی ہوں۔ اصل میں سویاں پکانا تو میں نے انہی ٹیچر بہنوں سے سیکھا ہے جیرجی' عید کا دن آ گیا ہم میز پر کھانے سجائے بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے تھے اب آئیں کہ اب آئیں راہ دیکھتے دیکھتے ہی پورے دو بج گئے۔ میں نے پریشان ہو کر انہیں بھیجا جا کر دیکھیں تو یہی ہوا کیا؟ آئے کیوں نہیں ابھی تک، جیرجی' وہیں جا کر انہیں پتہ لگا اُن کے تو اچانک ایک دوسرے شہر مراد آباد سے بہت سے رشتے دار آ گئے ہیں۔ جہاں بڑا فساد ہوا تھا۔ مصیبت کے مارے بیچارے بچے، عورتیں، مرد ملا کر پورے پندرہ جنے تھے۔ اِدھر دونوں بہنیں پریشان، ماتھے پر ہاتھ دھرے بیٹھی سوچ رہی تھیں، اب کیا کریں۔ ان کے لیے پکائیں کہ ہمارے یہاں کی عید کی پہلی دعوت میں آئیں۔ یہ ہمارے بڑے دل والے ہیں ایسے موقعوں پر وہ انہیں گھراتے سب کو آگے لگا لیا۔ چلو چلو ہمارے یہاں سب کے لیے کھانا پکا ہے۔ واہگورو کی بڑی مہر ہے، اور جی آپ یہ سمجھیے کہ مجھے کوئی بھی چیز پھر سے نہیں پکانی پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا، میں نے ان ہی سب کے لیے پہلے سے جاڑ پکار رکھا تھا۔ سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور ہزار دعائیں دیتے ہوئے لوٹے اور وہ دونوں ٹیچر بہنیں بھی خوش تھیں بہت ہی خوش۔ آپ سمجھ سکتے ہیں!"

سردار جی نے میری ران پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔۔۔ "دیکھا جی! اب تو یقین کر دگے، کوئی کسی کا کھانا جو جس کے نصیب میں ہوتا ہے، اُسے وہی تو کھائے گا اور ضرور بالضرور کھائے گا آج سے

میری یہ بات پلے سے باندھ لو۔ لو سیب کھاؤ۔ اب تو لکھنؤ والا تکلف نہیں دکھاؤ گے؟
میں نے جتنے سیب کاٹ کاٹ کر بیرے سامنے رکھے میں بڑی خاموشی سے کھاتا رہا اور سردار کی
طرف بھی حیرت سے تاکتا رہا جس طرح اخروٹ کے بہت سخت چھلکے کے اندر نرم نرم گودہ ہوتا ہے۔ وہ بھی
ویسا ہی نکلا ایک دوسرا ہی آدمی
اچانک اُن کے بچے نے کروٹ بدلی تو دونوں لپک کر اُس کے اوپر جھک گئے۔ "سیب کھاؤ گے
بچے! کھالو بیٹا۔ بہت میٹھے اور نرم ہیں"
لیکن بچہ پھر سو گیا۔ سردار پھر میرے پاس آ بیٹھا تو میں نے پوچھا ــــ بچے کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟"
"بس جی' واہگورو کی کرپا ہے" اُس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور خاموش ہو گیا مجھے پورے
جواب کا منتظر پا کر بیبی بولی۔
"جب ہمارا منّا پیدا ہوا تو بہت کمزور تھا ڈاکٹروں نے کہا' اس کے دل میں ایک چھید ہے جب
تک آپریشن نہیں ہوتا یہ ٹھیک نہیں ہوگا چار سال کا ہوا تو اسے ہم ویلور لے گئے ساؤتھ انڈیا میں تب
وہیں سب سے بڑا ہسپتال تھا' جہاں دُور دُور سے دل کے مریض لائے جاتے تھے ہمارے بچے کا آپریشن
کامیاب تو ہو گیا' پر بڑے ڈاکٹر صاحب نے کہا ــــ ایک آپریشن اور بھی ہوگا جب اس کی عمر پندرہ سال کی ہو جائے
گی تب' پھر سے کریں گے۔ اب وہی ڈاکٹر صاحب دلّی کے سب سے بڑے اسپتال میں ہیں۔ ہمارے پاس اُن کا
خط آگیا ہے وہاں جانے سے پہلے ہم دربار صاحب کے درشنوں کے لیے جا رہے ہیں امرتسر" یہ کہتے
کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تیر تیر گئے۔
"واہگورو' واہگورو۔" سردار نے نم دار آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔
"آپ جی بھی امرتسر جا رہے ہو؟" جیسے وہ موضوع بدلنا چاہتا ہو۔
"میں تو لاہور جا رہا ہوں"
"اچھا جی! تو آپ پاکستان کے رہنے والے ہیں؟"
لاہور کا ذکر سن کر دونوں چونک پڑے تھے بیبی تو کئی لمحوں تک میری طرف تاکتی ہی رہ گئی تھی۔
"کبھی وہیں کا تھا' تقسیم کے بعد ادھر آگیا تھا" یہ کہتے کہتے میں نے محسوس کیا کہ اس انکشاف
کے بعد کہ میں بھی اُن کا ہم زباں ہوں' ہماری باتوں کی ساری دلچسپی اب ختم ہو جائے گی' لیکن ایسا نہ ہوا۔

عیسیٰ نے بڑے تجسس سے پوچھا

"آپ لاہور میں کہاں رہتے تھے؟"

کبھی کبھی کسی سوال کے پوچھے جانے کے ساتھ ہی جیسے اپنے آپ اس کا جواب بھی مل جاتا ہے۔
میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کے پردے یکبارگی سرکتے ہوئے دیکھے۔ "آپ تو منٹگمری پارک میں رہتے تھے ہمارے مکان کے سامنے جہاں تکونا پارک تھا"

میں بھی جیسے یادوں کے دھندلکوں کی کئی تہیں آناً فاناً پار کر کے اسی تکونا پارک کے اس ایک کمرے والے کرائے کے حجرے جا پہنچا۔ جہاں میرے ساتھ میرا اسد سودی بھی رہتا تھا۔ ہم دونوں ریلوے کی الگ الگ ورکشاپوں میں اپرینٹس شپ کر رہے تھے صبح سویرے جب لوگ ہوا خوری کے لیے جو دو گرم گرم پھلکوں میں لپیٹ کر باہر نکل پڑتے ہم تیل سے داغ داغ کپڑے اوٹ اور پیٹ پیٹ مغلپورہ کی جانب جا رہے ہوتے تھے ہزاروں آدمیوں اور بے شمار مشینوں کے بے پناہ شور، انجنوں کی چیخوں، لوہے کے رنگ آلود ڈھانچوں اور میل اور گرد کی بو کے درمیان آٹھ گھنٹے گزار کر جب واپس آ جاتے تو ہمارے دل و دماغ لاہور کی حسین اور رومانی فضا میں لوٹ آنے کی خوشی سے معمور ہوتے تھے۔ ہماری اُنیس بیس سال کی عمر کا وہ دور ہماری ادبی تخلیق نشوونما کے لیے بے حد سازگار تھا — دیکھا محسوس کیا اور سیا اور کچھ لکھنے کے لیے ہر وقت خود کو تیار پایا، ہمارے لیے ایک اَن دیکھی دنیا ہی کو دریافت کرنے کے مترادف بن گیا تھا۔ —
میں نے سودی (اپنے ساتھی کو میں اسی نام سے پکارتا تھا) کو اشارے سے بتایا تھا — اُدھر دیکھ یار — پٹھا ایک اور جوان بیوی لے آیا ہے! لوٹا ہے لوٹا بالکل!"

ایک اونچا لمبا سردار ایسی ہی نوبلی چاند سی صورت والی دلہن کے ساتھ مکان کی دوسری منزل پر لوہے کے جنگلے پر جھکا ہوا کسی بات پر ہنس رہا تھا لیکن ان دنوں ہماری تمام تر توجہ کا مرکز اس کی پہلی بیوی بن گئی تھی۔ جو عمر میں سردار سے بڑی لگتی تھی۔ زیادہ دلکش نہیں تھی لیکن ہمیں اس کی محرومی سے ہمدردی تھی۔ چونکہ ہم آتے جاتے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ بھی آنکھوں پر لگائی ہوئی عینک میں ہماری طرف جاسی متوحش نظروں سے گھورنے لگتی تھی۔

"میں تو آپ کو بالکل نہیں پہچان سکا جی۔ مدت گزر گئی ہے اب تو چہرے بدل گئے عمریں بڑھ گئیں ہے جن کے بال کالے ہوتے تھے اب برف کے گالوں جیسے ہو گئے ہیں پھر بھی وہ زمانہ خوب تھا

بنا ہوا تھا۔" اچانک سردار جی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اُٹھ کر اوپر رکھے ہوئے بریف کیس کو کھولا اور اُس میں سے ایک بوتل برآمد کر لی اور بولا ــــ "واہ! آپ تو لاہور کل پہنچیں گے، ہم آج ہی، یہیں، اسی جگہ پر اپنا لاہور آباد کیے لیتے ہیں۔" عیسیٰ ٹوکری میں سے دو گلاس تو نکالا۔ فلاسک میں ٹھنڈا پانی بھی ہوگا نا!"

ایک اچھی بہو کی طرح اس نے رسماً اعتراض کرنا بھی ضروری سمجھا ــــ "کیا گاڑی کے اندر ہلا گلا کرنا مناسب ہوگا؟"

"کیا کروں، لاہور کا ذکر آنے پر رہا نہیں جاتا۔ لاؤ نکال دو گلاس جھٹ پٹ۔ باؤ جی بھی کیا یاد کریں گے، لاہور کا رشتہ کتنا مضبوط ہوتا ہے!"

اس نے دو گلاس بنا کر ایک میرے ہاتھ میں دے دیا اور بولا ــــ "لے پکڑ باؤ" اور اپنا گلاس اٹھا کر بولا ــــ "لاہور کے نام!" یہ کہہ کر وہ غٹاغٹ پی گیا۔

میرا انتظار کیے بغیر وہ ایک آدھ گلاس اور اسی طرح جلدی جلدی پی گیا اور بولا ــــ "لاہور مجھے اس لیے نہیں بھولتا کہ وہ میری زندگی کی ساری جدوجہد کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اُسی نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا تھا ــــ اور اُسی نے مجھے اپنی سرحدوں سے نکال کر زندہ رہنے کے لیے ایک نئی جگہ میں بھی دھکیل دیا تھا ــــ اس سلوک کے لیے بھی میں لاہور کا شکر گزار ہوں کہ اب میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں بھی لاہوری خون کا ہاتھ ہے جو ابھی تک میری رگ رگ میں دوڑا پھرتا ہے۔"

میرے ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس دیکھ کر وہ مصنوعی خفگی سے بولا ــــ "باؤ جی، ابھی تک اسے لیے بیٹھے ہو؟ پیو نا، اسے ختم کرو تو دوسرا بنا کر دوں۔"

عیسیٰ جو ہماری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی بولی ــــ "ان کے ماں باپ تو سکھر میں رہتے تھے، پر انہوں نے سارا وقت لاہور ہی میں گزارا تھا۔"

"او جی، بس شروع کے ہی دس سال تو ہم اپنے باپ کے ساتھ رہ پائے تھے۔ وہ ریلوے میں ڈرائیور تھے۔ جگہ جگہ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کراچی، تو کبھی کوئٹہ۔ فورٹ سنڈیمان اور ایران کے بارڈر پر زاہدان میں بھی رہے۔ جب ہماری اماں نے واہگورو اُس کا شکر لوگوں میں پاس کر کے تار توڑ بچے جنے شروع کر دیے تو انہوں نے سب کو لاہور میں ایک مکان لے کر دے دیا۔ کہا، اسی میں رہ کر کھیلو اور پڑھو۔ ابا جو ریٹائرڈ ہونے سے کچھ سال پہلے ڈپٹی کنٹرولر ہو کر لاہور چلے آئے تھے سکتے تھے۔ اب کہیں

نہیں جاؤں گا، یہیں رہ کر بچوں کو دیکھوں گا، اُن کی شادیاں کروں گا لیکن ابھی تینوں بڑے لڑکوں کو ٹھکانے
لگا پائے تھے کہ دادا حضور نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ تین لڑکے اور لڑکیاں ابھی باقی تھیں اب میں ہی اُن میں
بڑا تھا ہماری ماں بڑے حوصلہ والی تھی ہی۔ اُسی دیکھ کر میں نے بھی قسم کھائی کہ پہلے بہنوں، بھائیوں کی تعلیم پوری
کروں گا، ان کے بیاہ کروں گا اس کے بعد ہی اپنے بارے میں کچھ سوچوں گا بڑے بھائی (اسی زمانے میں انجینئر
کرکے) ڈیلی کی طرف نکل گئے تھے انہوں نے پلٹ کر بھی خبر نہ لی۔ پر ایشور نے بڑی کرپا کی چھوٹی بہنیں اور بھائی
سب محنتی تھے پڑھنے لکھنے سے جی نہیں چراتے تھے کوئی انجینئر کی سوئی ہی کوئی کسی نرس میں گئی۔ جو
سب سے چھوٹی بہن گریجویٹ ہو رہی تھی اس نے خود ہی ایک ڈاکٹر سے لو میرج کر لی۔ تین بھائیوں میں ایک تو مارس سروس میں ہے
ہے دو کو میرٹ ارشن کا رتبہ ہے ایسا۔ پھر جی کیا ہوا کہ میری عمر پینتیس سال سے بھی اوپر ہو گئی۔ چھوٹی
چھوٹی سی اسار ستیرے کرتے کرتے، داڑھی مونچھوں کے بال تک پکنے شروع ہو گئے تھے اب تو کوئی مجھے اپنی
لڑکی دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا تھا"

"یہ کیا آپ نے تو مجھے شروع کر دی آپ بیتی؟" اس کی بیوی نے اچانک اُسے ٹوک دیا۔

"میری رام کہانی تو ذرا ترسے والی ایک چہرے پہ پہلی ملاقات کو یاد دلاتے ہی پاس ملا تھا نہیں
لہجے سے۔ وہ تو ڈیلی گریجویٹ کرکے بیٹے تو ٹوٹ گیا تھا ہمارے سامنے ایسا کوئی تصور تک نہیں ہے۔ یہ ساری
باتیں یاد کرنے کا تو پورا حق ہے جیسے کو صحبت اُبھرے تھا۔"

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائے ـــ "ہاں تو یاد ہی میں کہہ رہا تھا کہ میری ایک موسیری
بہن کنواری بیٹھی تھی۔ کافی عمر ہو گئی ہے اس کی۔ کہیں رشتہ وشتہ نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن موسی جی
ماں کے سامنے بیٹھی زیادہ فکر استادی کی تھی روتے ہوئے چلی جا رہی تھی کہ میں اس کے رونے کی آواز سن کر
اُن کے سامنے چلا گیا مجھے دیکھتے ہی موسی نے میرے سامنے جھولی پھیلا دی۔ بولی ـــ مسلمانوں
کو تو بیٹا کچھ نہیں کہتا۔ رشتے داروں میں شادی کر لیتے ہیں۔ ہم کیوں پرائی دیکھیں مائیں
اپنے ہی وطن بھی الگ الگ میری بات تو کیا سنے۔ کہوں۔ بس اتنی سی بات پر میری ماں
نے بھی ماں کی لاج رکھ لی۔ اگر مجھے یہ سو فیصدی بالکل پسند نہیں تھی۔ اگر کسی
تھوڑی سی چلبل چنچل پیاری تھی تو جو تمہارے سامنے

اُس نے اپنی بیوی کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی نئے طرح شرمائے جا رہی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے سرزنش بھی کرتی جا رہی تھی کہ بس اب آگے اور کچھ مت کہنا"

لیکن اس نے اپنی داستان جاری رکھی۔ گھونٹ گھونٹ پیتا بھی رہا۔ "تمہیں یہ معلوم کر کے حیرانی ہوگی کہ ایک وقت میں میں نے ٹرک ڈرائیوری بھی کی تھی۔ دُور دُور سے تیل کے ڈرم لاد لاد کر لاہور کے کارخانوں میں پہنچاتا تھا۔ ایک بار لاہور میں ملیودہ کے پُل پر یہ ٹرک اُلٹ گیا۔ سارے ڈرم بھی گر کر اور پھوٹ گئے۔ کالے کالے گاڑھے گاڑھے موبل آئل کا ایک دریا سا بہہ نکلا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے لوگ جو دفتروں کو جا رہے تھے اور بچے جو پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے تھے، اس میں پھسل پھسل پڑے تھے۔ وہ منظر مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس لیے یاد ہے کہ اسی روز میری سگائی ہوئی تھی اور میں تھانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مالکوں کا ہزاروں روپوں کا نقصان تو ہو گیا تھا۔"

اس کی بیوی کو شاید نیند ستانے لگی تھی، یا وہ سونے کا محض بہانہ کر رہی تھی، اپنے بیٹے کے پاس ذرا سی جگہ بنا کر لیٹ گئی۔ وہ اپنی بیوی کی طرف گہری نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میں نے پوچھا — "آپ انہیں عینی کیوں کہتے ہیں؟ کیا آپ کو اُردو کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"

وہ حیران ہو کر بولا — "کون سی مشہور ادیبہ؟ میں نے تو کبھی اُردو کا اخبار بھی نہیں پڑھا۔ شعر و شاعری کا بھی بس اسی حد تک دلدادہ ہوں کہ کبھی کبھار افسروں کے حکم پر مشاعروں کے اُونچی قیمت پر ٹکٹ خریدنے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا پورا نام عصمت کور ہے۔ بس پیار سے میں نے اُسے عینی کہنا شروع کر دیا تھا جب یہ میری زندگی میں آئی۔ یہ بھی بس اتفاق ہی سمجھو کہ اس کا میرے ساتھ رشتہ ہو گیا جب کہ عرصہ تک میری پہلی بیوی کے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔ میں نے بیوی سے کہہ کر اُسے بھی مانگ لیا ورنہ یہ تو کسی اور کو چاہتی تھی۔ میں جانتا ہوں وہ لاہور ہی میں مارا گیا تھا۔ اس کا ذکر ہم کبھی نہیں کرتے لیکن میں اس کی آنکھوں میں لہراتی ہوئی پرچھائیاں دیکھ کر سب سمجھ جاتا ہوں اور اس کا من پرچانے کے لیے کوئی نہ کوئی گیت سنانے بیٹھ جاتا ہوں جس پر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں —" یہ کہہ کر وہ بہت دھیمے دھیمے سُروں میں گانے لگا —

ایدھر اُدھر لُک لُک ہس تکلاں شہروں پار دیاں

رُوماں وانگوں کولوں لنگھس مہکاں باسی ہار دیاں
قبرستاں وے رستے دس گُوکاں سہرے واریاں (میر یاری)

(اس پار کے شہر کی کوئی سکل اِدھراُدھر چھپ چھپا کر بہتی پھرتی ہے۔ باسی ہاروں کی خوشبوئیں روتوں کی امد باس سے نکل جاتی ہیں۔ سہریدار کی بیٹیاں (مجھے) قبرستاں کا راستہ دکھا رہی ہیں)

گاتے گاتے اس کے اپنے آنسو بھی بہہ نکلے۔ است کو گہری نیند سو گئی تھی۔ وہ اس کی طرف کتنے لمحوں تک تاکتا رہا پھر بولا۔ "ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! یہ عورت مجھے بچہ نہ دے سکی تو پہلی عورت کے ہی بطن سے ہمارا لڑکا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اب ایسی ہی اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے"

"لیکن اُن کی شکل اُردو کی بیبی سے حیرت ناک حد تک ملتی ہے!" میں ابھی تک آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا اسی کے دلکش چہرے کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔

اس نے اچانک جیسے مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کہا ۔۔۔ "چھوڑو جی! کیا رکھا ہے ان باتوں میں! یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ ایک سے کئی کئی نام مل جائیں گے اور ایک سی کئی کئی صورتیں بھی۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچو گے کہ کوئی شہر بھی کسی دوسرے شہر جیسا ہوتا ہے۔ جیسے لاہور، لاہور ہی ہے۔ اٹھاؤ اپنا گلاس۔ ہم آخری گلاس بھی اپنے شہر ہی کے نام پر کیوں نہ پئیں!"

۔۔۔۔ ۱ ۲ ۳ ۔۔۔۔

لاکھوں میں ایک

پبلک گیس سروس کے سامنے اپنے اپنے خالی سیلنڈر لیے بے شمار لوگ لائن میں لگے ہوئے تھے۔ دفتروں کے بابو، امیروں کے نوکر، گھریلو قسم کی عورتیں اور میرے جیسے کچھ ریٹائرڈ لوگ بھی۔۔۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ گیس سے بھرے ہوئے سیلنڈروں کا ٹرک آ چکا تھا جس کی اطلاع آس پاس کی کالونیوں میں رہنے والوں کو فوراً ہو گئی تھی۔ اس لیے کارڈ ہولڈرز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

مل نگم کی طویل سروس سے سبکدوش، سکینہ اس لیے اخبار پڑھنے میں محو تھا کہ ابھی آدھ گھنٹہ اور اُس کی باری نہیں آ سکتی تھی اور وہ جو بھی معمولی سی سیاسی یا جرم کی خبر پڑھتا، اس پر فوراً اپنا تبصرہ بھی تر و تازہ کر دیتا۔ آگے پیچھے اور سامنے کی لائنوں میں کھڑے ہوئے لوگ اس کی باتوں میں دلچسپی بھی لے رہے تھے اور اُن کے چہروں پر یہ کیفیت بھی صاف نظر آتی تھی کہ وہ سکینہ کو جانا سکی محو رہے ہیں میں بھی اسی کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک ایک رکشا سے ایک عورت کو خالی سلنڈر کے ساتھ اُترتا دیکھ کر میں چونک اُٹھا مجھے ایسا لگا، اُسے کبھی کہیں دیکھا ہے۔ پینتالیس سال کی دُبلی پتلی اور لمبی عورت جس کے بال تارہ تارہ ڈائی کیے ہوئے تھے اور اندرا گاندھی کی نقل میں اس نے بھی بالوں کی ایک لٹ کو سفید چھوڑ دیا تھا۔۔۔ ہم لوگ مذاق میں اس لٹ کو عالمی سیاست کی ہر میویر

کہا کرتے تھے۔ میرؔ بہاری نے اسی تشبیہ کا ایک خوبصورت استعمال اور طریقے سے کیا ہے۔ وہ کشور
ناہید کی پوری شخصیت ہی کو اردو شاعری کی ہر سوئر کہتا ہے۔ اس وقت صبح سے قطاروں میں
لگے ہوئے تھکے تھکے اور بیزار لوگوں کی بھیڑ میں اُس عورت کا وجود بھی دھوپ میں چمکتی اور بل کھاتی
ہوئی ہر سوئر جیسا لگا۔ اس نے رکشا والے کو غالباً اپنے ابروؤں کے اشارے ہی سے خالی
سلنڈر اتار کر پیچھے رکھنے کے لیے کہا رکشے والے نے نہ صرف سلنڈر اُتار دیا بلکہ اس کے ہاتھ سے
کارڈ بھی لے لیا ہماری کیو کے آخری سرے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھیڑ کو نظر انداز کر کے ڈپو کے شیشے والی دیواروں کے اندر کیبن کے اندر گھستی چلی
گئی تو مجھے یاد آیا ـــ "یہ تو بھیروی سا مرتھ ہے" لیکن میرا دل ایک نامعلوم سے خوف سے
یک بیک بھر گیا۔ اس کے بعد میرے اندر اتنی جرأت باقی نہ رہی کہ سر اٹھا کر کیبن کی طرف بھی
دیکھتا جو مجھ سے دس بارہ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں گردن گھما کر سکینہ کی باتیں سننے لگا ــــــ
"ٹیلیو اسٹاٹا کا پریشر کے بعد بھارت میں تشدد آت امریکہ اور یورپ کی مانند زیادہ سائنٹفک
ہوتا جا رہا ہے۔"

ریلوے کی ملازمت میں میری عمر عزیز کے اکتالیس سال صرف ہو گئے تھے ان میں میرا
پچیس سال کا عرصہ ٹرینوں میں مسلسل سفر کرتے ہوئے بیتا تھا اور میں ہندوستان کے طول و عرض
میں اس لیے نے تھکے گھومتا پھرا تھا کہ مجھے نئی نئی جگہیں دیکھنے کا شوق تھا بیشمار رنگ ونسل اور
مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں سے ملنے کے موقعے ملتے تھے نہ صرف ملنے کے بلکہ اُن کے رویّوں
کو سمجھنے کے بھی

ایک بار کلکتہ کے ویٹنگ روم میں اپنے پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں دوسروں کی نظر بچا کر
ڈرائی جن ملا کر پی رہا تھا کہ اچانک میری عمر کا یعنی پچاس ایک سال کا ایک صحت مند آدمی میرے پاس
آ کر کھڑا ہو گیا اور بے اختیار ہنسنے لگا اس کے لباس اور چہرے کو دیکھ کر پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ
سی آئی ڈی کا کوئی آدمی ہے یا پھر ریلوے ہی کا چھوٹا موٹا افسر لیکن وہ میری گھبراہٹ دیکھ کر
وہ مجھ پر ذرا جھکا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں بولا ـــــ "کیری آن اولڈ بوائے (CARRY ON
OLD BOY) یہ طریقہ اچھا ہے میرے سوٹ کیس میں بھی وہسکی رکھی ہے لیکن

ے پھر کسی وقت چلیں گے۔ اس وقت مجھے اجازت دو کہ میں بھی اپنے گلاس میں پانی لے کر تمہارے پاس
آ بیٹھوں۔ میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں۔"
میں نے انکار نہ کیا۔ اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ایک سے پہلے دو، اور کچھ نہیں تو اس کی باتیں
ہی سننے کا موقع ملے گا۔ یوں بھی میں دوسروں کی باتیں سننے کا عادی ہوں۔ ایک بار میری اسی عادت
سے بیزار ہو کر ضمیر احمد صوفی نے کہا تھا۔ "تم دوسرے لوگوں کو کیونکر برداشت کر لیتے ہو۔ یہ دیکھ
کر حیرت ہوتی ہے!" میں نے اُسے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ "ہر ایک لڑکے اندر بھی اس کی
کہانی ہوتی ہے کیا معلوم وہ کب میرے لیے کوئی شاہکار اُگل دے"
میرے ساتھ دوسرا ہی پیگ شروع کرتے وقت رجیت گرودور نے ایک قصہ سا نا شروع کر دیا تھا
— "میں جنگلات کے ایک بہت بڑے ٹھیکیدار کا منیجر ہوں۔ زیادہ تر ایسٹرن انڈیا میں گھومتا رہتا
ہوں۔ کبھی گوہاٹی، کبھی شیلانگ کبھی کلکتہ — اُدھر بہار تھ ایسٹ میں بھی گور گسور اور کیمری کے آگے تک
جانا ہوتا ہے۔ دہلی میرا ہیڈ کوارٹر ہے۔ بس ہیڈ کوارٹر ہی سمجھو۔ گھر کہیں نہیں ہے۔ اس کی میں نے
کبھی فکر بھی نہیں کی ہے۔ جب زندگی اسی طرح بڑے مزے سے گزر رہی ہے تو ایسے اردگرد چہار دیواری
کیوں تعمیر کروں۔ چہار دیواری بنالوں گا تو اس کے اندر ایک عورت بھی ضرور رکھوں گا۔ عورت رکھوں گا
تو پھر وہ مجھ سے سب کچھ مانگے گی — بچے، ساماں، پورا ماحول۔ یہ سب اپنے بس کا نہیں ہے یارا
شاید میں یہ ذمہ داریاں اُٹھانے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا!"
وہ کچھ دیر تک ہنستا رہا۔ پھر برآمدے میں لگے کولر سے میرے اُٹھے ایسے گلاس میں اور پانی بھر
لایا۔ میں نے دونوں گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی اور جن ملا دی اور کہا۔ "یہ آخری پیگ ہے۔ اس کے
بعد مجھے گاڑی پکڑنی ہے" — وہ سگریٹ سلگا کر بولا — "اس مسلسل دربدری میں یہ لطیفہ بات
تو ضرور ملا ہے کہ مجھے ایک ایسی عورت کا عشق حاصل ہو گیا ہے جو مجھ سے بدلے میں کچھ نہیں مانگتی۔
نہ گھر، نہ روپیہ، نہ اور کچھ۔ کچھ بھی تو نہیں یار۔ وہ تو بس یہی چاہتی ہے کہ میں کبھی کبھی — دو
ایک ہفتے کے بعد اس سے مل کر آیا کروں۔ میں قسم کھا کر کہنے کے لیے تیار ہوں۔ اس میں ذرا سا
بھی جھوٹ نہیں ہے۔ دیکھو اس وقت میرے ہاتھ میں شراب کا گلاس ہے یا شراب سے بہت
ناپاک اور ریفائنڈ (REFINED) چیز ہوتی ہے۔ اتنا زیادہ ریفائنڈ تو خدا کا کوئی

سدہ بھی نہیں ہو سکتا یار م۔ میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں ۔۔ میں اس عورت کے ایثار اور اس کی محبت سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اب زندگی میں مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے!"

جب میں اس سے رخصت ہو کر ٹرین کی طرف لپک رہا تھا تو مجھے معاً یاد آیا، یہ تو وہی آدمی تھا جو کسی نہ کسی بڑے شہر کے ویٹنگ روم میں، پورے بنچ پر ہولڈال بچھائے بڑی خاموشی سے سگریٹ پیتا ہوا اور دوسرے مسافروں کو بڑے فلسفیانہ انداز سے تکتا ہوا نظر آتا تھا کافی عرصہ ہوا ایک بار لکھنؤ کے بک اسٹال پر پہنچا تو بک ایجنٹ نے جو مجھے اچھی طرح جانتا تھا، ایک رسالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ " اس میں آپ کی کہانی آئی ہے آپ نے دیکھی؟"

وہ آدمی اسٹال کے اندر میری طرف پیٹھ کئے کچھ انگریزی ناول نکال کر انہیں دیکھنے میں محو تھا۔۔ ایجنٹ کی بات سن کر اس نے بڑی بے نیازی سے سر گھما کر میری طرف دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر میرے پاس چلا آیا تھا، اپنا ہاتھ بڑھا کر پوچھا تھا۔۔ "آپ کہانی لکھتے ہیں؟" پھر میرے ہاتھ سے رسالہ بھی لے لیا تھا اور جسے کھول کر میں جلدی جلدی دیکھ رہا تھا۔۔ اسی مقام کو بڑے غور سے دیکھ کر اس نے کہا تھا "یہ کہانی میں پڑھ چکا ہوں لیکن یہ تو آپ نے موپاساں کی ایک بڑی مشہور کہانی پر بیس (BASE) کی ہے!"

اس آدمی کا برسوں کا گرد و غبار میں کھویا ہوا وہ چہرہ مجھے اب صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ ہم بہت سے لوگ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب کبھی نہیں آتے شاید اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے یا میرے دل میں ایک چور بھی تھا تیس پینتیس سال پہلے موپاساں کی جس کہانی کو میں نے صاف اُڑا لیا تھا، اس کا راز صرف اسی کو معلوم تھا میرے ہزاروں پڑھنے والوں میں صرف وہی جانتا تھا۔ شاید اسی لیے میں پھر بیس سال تک اس سے ہم کلام نہیں ہو سکا تھا، لیکن اب وہ میرا چہرہ بھی بھول چکا تھا اُسے معلوم بھی نہیں تھا کہ میں ایک کہانی کار ہوں اب تو وہ خود میرے لیے ایک کہانی کار تھا۔ اس کی ادھوری کہانی مجھے بڑا لطف دے گئی تھی۔

چھ ماہ کے بعد ہم پھر ایک ویٹنگ روم میں اکٹھے بیٹھے تھے اب ہم سیکنڈ میں تھے وہاں ہمارے سوا کوئی نہیں تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے بیرے کو بھیج کر پیالی وہسکی منگائی تھی۔ دو دو ست چسکی

تھی۔ اور جب وہ موڈ میں آ گیا تو اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی تھی ۔۔۔ "وہ ایک شادی شدہ عورت ہے یہ بات آپ کو پہلی بار سنا رہا ہوں۔ لیکن یہ آپ کی بدقسمتی نہیں ہے ۔۔۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی بے حد خوش ہے۔ جیسے کہ کسی بھی عورت کو ہونا چاہیے جس کا شوہر اُسے ہر قسم کی آسائش دے سکتا ہو، لیکن یارم وہ مجھ سے بھی اتنی ہی شدت سے محبت کرتی ہے کبھی کبھی میں بہت حیران ہو جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ ایسا کیوں ہے؟ میں تو اُسے کچھ بھی نہیں دے سکتا وہ کچھ طلب بھی نہیں کرتی یارم بس ایک سلسلہ چل رہا ہے کہ وہ میرا انتظار کرتی رہتی ہے اور میں کبھی کبھی اچانک اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں، جیسے اس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اس کے آدمی کا ہے۔ کیا تمہیں یہ سب عجیب نہیں لگتا یارم تم بھی بڑے عجیب ہو میری طرح ادیب ہو زندگی کا خاصہ تجربہ بھی رکھتے ہو یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، بالکل بکواس کر رہا ہوں۔"

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟"

یہ بات میں نے بہت اُداس ہو کر اس سے تیسری ملاقات میں پوچھی تھی جب ہم گورکھپور سے کانپور تک ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے فرسٹ کلاس کے ایک کونے میں وہ بیلے کی طرح اپنی فصونہ کا دستہ چھیڑے ہوئے تھا میری بات سُن کر وہ حیران رہ گیا تھا آنکھوں کی طرح بیراسمہ بیچے لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں حسد کی جھلک بھی دکھائی دی تھی ۔۔۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا تھا ۔۔۔ "ہاں، یارم، وہ واقعی بے حد خوبصورت ہے اتنی زیادہ کہ اگر میں صحیح صحیح تعریف کروں گا تو تم اسے شاعرانہ مبالغہ سمجھو گے بس اتنا یقین کر لو کہ وہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔ لیکن تمہارے لہجے سے مجھے یہ احساس کیوں ہوا کہ تم کہیں اس سے محبت تو نہیں کرنے لگے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے اُسے دیکھا ہی کب ہے؟ پھر مجھے اس بات کا حق ہی نہیں پہنچتا کہ تمہارے ہوتے ہوئے اُس کے بارے میں کچھ سوچوں!"

"نہیں نہیں، میں تمہیں ایسا کرنے سے روکوں گا نہیں بلکہ خوش ہوں گا کہ ایک لولتا تمہارے انتخاب کی داد دی ہے اچھا تو کیا تم اُسے دیکھنا چاہتے ہو؟ چلو میرے ساتھ دلی۔ میں آج ورنہ جا رہا ہوں"

نہیں مجھے راستے میں کہیں رکنا ہے مگر کبھی نہیں " میں نے اُسے ٹال دیا

میں اس بات کا اعتراف کر سکتا ہوں کہ اُس کے منہ سے ایک نادیدہ عورت کے قصّے سُن سُن کر
میرے دل میں سچ مچ اُس کے لیے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی یہ وہم سر اٹھا لیتا تھا کہ
اس عورت کا دراصل کوئی وجود ہی نہیں ہے وہ اس کا محض دل بہلانے کے لئے الفاظ کا ایک
خوبصورت تاج محل سا بنا ہے یا ہو سکتا ہے اس نے واقعی اس عورت کو کہیں دیکھا ہو جو اُس کی
پہنچ سے پرے ہو بہت دور کی چیز ہو ۔

موپاساں کی کہانی (FOR A NIGHT OF LOVE) جسے میں نے " میں
تمہاری ہوں " کے عنوان سے ہندوستانی ماحول کا جامہ پہنایا تھا کا مصوّر ہیرو کہیں نہ کہیں
رنجیت گرودر ہو تو اپنے مکان کی دوسری منزل پر رات کے گہرے سناٹے میں کھڑکی کے پاس
بیٹھ کر فلوٹ بجایا کرتا تھا اور سڑک پار کے مکان میں رہنے والی وہ البیلی دوشیزہ جو بے پناہ خوبصورت
تھی، اس کے سُریلے سُر سُن کر اپنی کھڑکی کھول دیتی تھی اور ادھر اُدھر بڑی بے چینی سے تاکتی تھی اور
پھر اندر بیٹھے ہوئے اپنے گھر سے کہتی تھی ـــــ " شاید کہیں کوئی ریکارڈ بج رہا ہے " وہ فلوٹ
بجانا بھول کر اس کے ملکوتی حسن میں کھو جایا کرتا تھا جو اندر سے آنے والی روشنی میں چمک اُٹھتا
تھا ۔ اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے سنہرے بال، اس کے جوان متناسب بدن پر پہنا ہوا
ایک جالی کا ریشمی گون اور پھر جب وہ کچھ نہ پا پاتی تو اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بالوں کو گردن کی
پشت پہ پھینکتی ہوئی اندر چلی جاتی اور وہ اسی محویت سے نکل کر فلوٹ کو پھر سے ہونٹوں سے
لگا لیتا تھا

لیکن رنجیت گرودر تو بہت ہی خوبصورت ہے پچاس سال کی عمر میں بھی اتنا دلکش
ہے کہ اس پر کوئی بھی خوبصورت عورت فدا ہو سکتی ہے حسن عورت کا ذکر وہ اتنی چاہت کے
ساتھ کیا کرتا ہے اگر اس کا کوئی واقعی وجود ہے تو اسے ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے ۔

میں نے اس کے بارے میں کتنی بار سوچا تصوّر ہی تصوّر میں اسے کئی بار دیکھا اپنے طور
پر ایک بہت ہی دلکش پیکر بناتا اور اُسے جیتے جاگتے چاہنے لگا اگرچہ یہ سراسر خود فریبی تھی لیکن
کس قدر دلچسپ اور راحت بخش بھی تھی ۔

جب ہم اتفاق سے ایک روز ڈیرہ دون میں مل گئے تو وہ خاصا پریشان نظر آیا۔ ہماری میٹنگ حسبِ معمول شام کو شروع ہوتی۔ اس روز میں اس کا میزبان تھا۔ خلافِ معمول اُس نے کافی دیر تک زباں نہ کھولی تو میں بہت حیران ہوا۔ بہت کریدنے کے بعد اس نے بتایا۔ "تمہیں تو معلوم ہے یار میرا یہ سب یکطرفہ کھیل تماشا تھا۔ میرا مطلب اگر وہ مجھے اتنی لفٹ نہ دیتی تو میری اتنی ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اُس کے پاس بار بار جاتا۔ اس کے حسن میں ایسا شکوہ اور وقار تھا کہ کوئی نامحرم تو اس سے کلام کرتے ہوئے ہی جھجکتا تھا لیکن اُس نے مجھے اس قدر بے تکلف ہونے پر مجبور کر دیا تھا کہ میں اسے ہمیشہ ایوا گارڈنر کہہ کر بلاتا تھا۔ ہمارا تعلق بھی تو اُسی نسل سے ہے جو کسی زمانے میں ایوا کی بڑی دیوانی تھی۔ مجھے ایسا بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے ——— ایوا گارڈنر کسی بے وفا بیوی کا رول ادا کر رہی ہو اور میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ بے وفا ہے اپنے شوہر کو دھوکہ دے رہی ہے اس کے پاس جانے سے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ لیکن اس بار اس کے یہاں گیا تو وہاں ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لوگ باگ بڑی بے چینی سے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ باہر بھی جمع تھے۔ معلوم ہوا کہ اُس کا شوہر اچانک چل بسا ہے۔ میں جلدی سے اُس کے پاس اندر پہنچا۔ وہ سوگوار عورتوں کے درمیان گھری ہوئی بیٹھی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اُس کی آنکھیں بے حد غمناک ضرور تھیں۔ اتنی اُداسی میں بھی اُس کے چہرے پر وہی شاہانہ وقار نظر آ رہا تھا جو اُس کی شخصیت کا امتیاز تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر میرے پاس آ گئی ——— بولی۔ "اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں بہت گھبرائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہاں تو میرا کوئی رشتہ دار بھی نہیں رہتا۔ میرے پتی کا بھی کوئی نہیں ہے۔ سب دور دور شہروں میں رہتے ہیں۔ دوسرے یہاں آج تو پہنچ بھی نہیں سکتے۔ پھر بھی تم انہیں فون ضرور کر دو۔ میں سب کے نمبر دیتی ہوں۔ کسی کسی کو تار بھی دینا ہوگا۔ لاش کی گاڑی بھی منگوانی ہے۔ دوسرے سارے انتظامات بھی کرنے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ سب تم کر لوگے۔"

میں نے سارے انتظامات چند گھنٹوں کے اندر کر دیئے۔ وہاں جتنے لوگ تھے، اُن کی نظروں میں میں ہی سب سے اہم بن گیا۔ شام کو شمشان سے لوٹ کر آیا تو اُس نے مجھے وہیں روک لیا۔ اُوپر کے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ نیچے اُس کی ماں بہنوں کی کچھ عورتیں پڑوس کی اُسکے

پاس نرک گئی تھیں۔ میں نے مدہوش ہوا تھا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ اگرچہ دن بھر جب میں اُس کے آدمی کی ارتھی تیار کرا کے اُسے آخری سفر کی طرف روانہ کر رہا تھا، میرے دل میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ وابستہ ہو جائے گی۔ اب مجھے اسی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ ایک گھر اور اُس کی چار دیواری کے اندر اور پھر اس کے وہ سارے مطالبات شروع ہو جائیں گے جو ایک بیوی کے حقوق کا حصہ ہوتے ہیں۔ اگر میں نے اس کے ساتھ کسی قسم کی لاپرواہی برتی تو وہ مجھ سے ناراضگی کا اظہار بھی کر سکتی ہے۔ شاید مجھ سے بھی اسی طرح بے وفائی کر گزرے جس طرح وہ اپنے شوہر کے ساتھ کرتی رہی تھی لیکن اُس کی عمر کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ اپنا محض وہم بھی لگا۔ وہ چالیس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اب اُسے ایک ہی جگہ ٹک کر رہنا پڑے گا، ایک ہی آدمی کے ساتھ۔

پتہ نہیں کتنی رات گزر گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اچانک کسی نے میرا شانہ ہلایا تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بولی ”گھبراؤ مت۔ یہ میں ہوں۔ ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔“

وہ ذرا کھسک کر میرے اور قریب ہو گئی۔ ”اب کل سے تمہیں ہمارا یہ گھر بکوانے کا انتظام کرنا ہے، کسی پراپرٹی ڈیلر سے مل کر۔ اور انشورنس کے دفتر بھی جانا ہے، اُس کی موت کا سرٹیفیکیٹ لے کر۔ یہ ساری رقم مل جائے تو ہم کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں۔ تمہارے خیال میں ہمیں کہاں جانا چاہیئے؟“

”یہ سب سن کر میرے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ گھر کے اندر اتنی بڑی ٹریجڈی ہو چکی تھی لیکن اُس کے اُوپر کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ مجھے یک بیک یوں لگا جیسے وہ کوئی ڈائن ہو، جو اپنے آدمی کا کچا کلیجہ چبا چکی ہوں۔ اب میں بھی اس کے قبضے میں ہوں، پوری طرح۔ صبح اُٹھتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا لیکن میں ڈرتا ہوں، وہ میرا پیچھا کر رہی ہوگی۔ مجھے کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لے گی!“

رنجیت گروور کو میں نے اس قدر خوف زدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عورت کی محبت تو انسان کو بہت ہی نڈر اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ اتنا مضبوط کہ وہ پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس پر شراب بھی کوئی اثر نہیں دکھا پا رہی تھی۔ میں

نے اُسے یاد دلایا۔ "موپاساں نے ایک کہانی لکھی تھی "دارا اے ماینٹ آف نو"۔ اُس کا ایک کردار اپنی محبوبہ کے کہنے پر اس کے کزن کی لاش اُٹھا کر لے جاتا ہے، جس کا کھیل کھیل میں ایک آہنی الماری کے ساتھ سر ٹکرا گیا تھا اور وہ مر گیا تھا۔۔۔ اس عورت نے جب اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑے پیار سے کہا تھا۔۔۔ "میں تمہاری ہوں، تم یہ کام کر سکتے ہو" تو اس کے دل میں ایک ہاتھی جیسی قوت پیدا ہو گئی تھی وہ رات کے اندھیرے میں لاش کو کندھے پر لاد کر ندی کے پُل پر لے گیا تھا ۔۔۔ اور جب اس نے مُردے کو نیچے لٹکانے سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا تھا تو اُسے یاد آیا تھا۔۔۔ "یہ آدمی میری مدھوری کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔۔۔ وہ ایک اطمینان سا محسوس کر کے کہ اُس سے نفرت کرنے والا ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے، اُس کی لاش کو دھیرے دھیرے نیچے لٹکانے لگا تھا۔ لیکن اچانک اس مُردے کے بازو اس کی گردن میں بہت مضبوطی سے حائل ہو گئے تھے۔ جن کی گرفت سے وہ ہزار کوشش کے باوجود خود کو آزاد نہیں کرا سکا اور لاش کے ساتھ ہی کئی سو فٹ نیچے ندی میں جا گرا تھا۔"

رنجیت حیران سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کئی لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا "ہم لوگ کتنے عرصے سے مل رہے ہیں لیکن تم نے کبھی لٹریچر پر گفتگو نہیں کی میں بھول گیا تھا کہ تم سے پھر کبھی ملاقات ہو سکے گی۔ لیکن اب میں جاؤں گا یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا کہیں بھی ایک دن سے زیادہ نہیں رکوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

پھر کئی روز بعد مجھے اس کا ایک خط ملا۔ وہ دہلی کے ایک ہسپتال میں بیمار تھا مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو اُس کی حالت اچھی نہیں تھی بہت کمزور ہو گیا تھا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سا بنا ہوا نظر آیا میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "یارم! اچھا ہوا تم آ گئے اب میں اطمینان سے مر سکوں گا جب بھی دم نکلے تم میرے پاس موجود رہو کیا ایسا ہو سکتا ہے یارم؟ کہو نا ایسا ہو سکتا ہے؟"

میں نے اسے اطمینان دلایا کہ میں اس سے ہر روز ملنے آیا کروں گا تو اُس نے کہا۔۔۔

"میری بیوی بھی ہر روز یہاں آتی ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے اُٹھ کر گئی ہے، لیکن میں

اُس سے اکیلے میں نہیں ملتا ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے، جب بھی وہ آئے میرے کمرے میں کوئی نرس یا وارڈ لوائے بھی ضرور موجود رہے۔ مجھے اب بھی اُس سے ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ کہتی ہے "میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی"۔ وہ سچ مچ ایسا کر سکتی ہے۔ مجھے یقین سا ہو گیا ہے، لیکن میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اُس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے یہاں سے اٹھوا کر لے جا سکتے ہو؟ آج ہی لے جاؤ کہیں بھی لے جاؤ۔"

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ کل آ کر یہ انتظام کر دوں گا، لیکن ذاتی طور پر وہ مجھے صحت مند معلوم نہ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ ایک مرض کی ہوتی بیماری کا شکار ہو جس حیالی عورت کی مورتی اُس نے رسوں کی محنت سے تراشی تھی، اُس کی اب پرچھائیں اس کے تعاقب میں تھی۔ جب اسپتال سے باہر نکلا تو بس کے اسٹاپ پر ایک بہت ہی خوبصورت عورت کیو میں کھڑی انتظار کر رہی تھی ایسے شاہانہ وقار کے ساتھ کھڑی تھی کہ جیسے وہ وہاں موجود سارے لوگوں سے الگ تھلگ قسم کی کوئی مخلوق ہو اُن سے اونچی، اُن سے دلکش، اُن سے بالکل لاتعلق۔ میری نظریں اُس سے ملیں تو وہ میری طرف دیکھتی سی رہ گئی جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو، یا میرے بارے میں کسی سے بہت کچھ سُن چکی ہو۔ ارجیت گرو ور نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ اُس نے کبھی اُس کے سامنے میرا بھی ذکر کیا تھا——— لیکن مجھے یقین ہو گیا وہ میرے بارے میں اُس سے ہمیشہ کچھ کہتا رہا تھا تبھی تو وہ اتنی غیر معمولی دلچسپی سے میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں اچانک ہی ایک تیز چمک پیدا ہو گئی تھی ایک ایسی چمک جس پر مسکراہٹ کا شبہ بھی کیا جا سکتا ہو میں چند لمحے اور اس کی طرف دیکھتا رہتا تو وہ سچ مچ مسکرا پڑتی لیکن میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

دوسرے روز میرے اندر اسپتال جانے کی ہمت نہیں تھی۔ ڈر گیا تھا کہیں پھر وہی سارقہ وہاں پھر نہ مل جائے۔ ڈاکٹر کو فون کر کے ارجیت کو اس اسپتال سے منتقل کرانے کے بارے میں بات کی تو مجھے بتایا گیا۔" اُس پیشنٹ کا تو کل ہی انتقال ہو گیا تھا اور اُس کی لاش ایک عورت کے حوالے کر دی گئی ہے جو اُسے دیکھنے کے لیے آتی تھی" یہ سُن کر مجھے بہت دُکھ بھی ہوا تھا، اور اطمینان بھی۔ لیکن میں اُسے کبھی بھلا نہ سکا وہ ایک اچھا اور دلچسپ ہمسفر تھا۔ جس کی

باتوں پر یقین ہوتا بھی تھا اور نہیں بھی ہوتا تھا۔ لیکن گیس کے سلنڈر بانٹنے والی کمپنی کے ڈپو کے سامنے کیو میں کھڑے کھڑے اُس عورت کو ایک مدت کے بعد اندر جاتے ہوئے دیکھا تو میرے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل سا ہو گیا میں نے اپنی باری چھوڑ دی، پھر کسی روز آنے کا فیصلہ کر کے اپنا سلنڈر جلدی جلدی اسکوٹر کے پیچھے باندھا اور وہاں سے چلا آیا

۲/۴/۲

۱

ایک قطرہ مثالِ دریا

اپنے مکاں کی دوسری منزل سے اُترتے ہوئے میں سوچتا آرہا تھا میرے ایونگ واک کے ساتھی قربان حسن نے کل اطلاع دی تھی، انشورنس والوں نے میرا چیک تیار کر دیا تھا دل میں کسی بھی وقت جا کر لے سکتا تھا اسی طرف لال باغ کے درزی کو سینے کے لیے کپڑے دے رکھے تھے۔ اُن کے ملنے کی تاریخ بھی اسی روز کی تھی۔۔ واپسی پر دھوپ بہت تیز ہو جائے گی کچھ وقت برٹش کونسل کی ایئرکنڈیشنڈ لائبریری میں کتابیں پڑھتے ہوئے کاٹا جا سکتا تھا لنچ گیانی جی کے ڈھابے میں کیا جا سکتا تھا۔ اُن کے ساتھ کچھ دیر پولٹکس پر بحث رہے گی اگرچہ اب وہ اس قدر افسردہ ہے کہ اُسے سی آئی۔ اے کی چالوں کے خلاف قائل کیا ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ٹھیک ہے، آج دن بھر کا یہی پروگرام رہے گا۔

نیچے آکر اپنی آٹو پر سے گرد جھاڑتا ہوں میٹر پڑھ کر اندازہ لگاتا ہوں ابھی تیس کلومیٹر اور چلنے کے لیے اس میں پٹرول ہے پہیوں میں ہوا بھی ٹھیک لگتی ہے دھوپ کی چمک سے آنکھوں کو بچانے کے لیے کالا چشمہ چڑھا لیتا ہوں اور آٹو اسٹارٹ کر دیتا ہوں۔ ایک لال گردن والی چڑیا پھُر سے پیڑ کی گھنی شاخوں میں سے نکلتی ہے اور پھر ایک لمبا چکر لگا کر بجلی کے تار پر جا بیٹھتی ہے اور اچانک مجھے یاد آتا ہے میں نے ٹوپی تو اٹھائی ہی نہیں۔

سر اٹھا کر اوپری کا نچ کی طرف دیکھتا ہوں سیمنٹ کی سی مرح کہر ل کی، جو میرا اسٹڈی روم بھی ہے اور بیڈروم بھی ریلنگ کے کنارے کنارے رکھے گملوں میں لگے پھول جیسے میری ہی طرف جھانک رہے تھے صبح اُٹھتے ہی حسبِ معمول انھیں پانی دیا تھا ان کی مسرور اور اشتیاق بھری نظروں میں ایک ہی سوال نظر آیا کب تک بوتوں گا،

میں آنکھیں بند کر دیتا ہوں تو اچانک میری ادھیڑ عمر بیوی ایک کمرے سے باہر آجاتی ہے۔

"کچھ بھول گئے کیا،"

اس کے پیچھے پیچھے میری پوتی اپنے اسکول کی ڈریس میں ہنستی ہوئی چلی آرہی ہے

"میں سمجھ گئی ماما، پی کیپ بھول آئے،" اور وہ پھدکتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھ جاتی ہے۔

تب تک میں چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا تھا چشمہ اتار کر پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔۔۔

"سمجھ میں نہیں آتا، اتنی دھوپ میں جاؤں کہ نہیں! کل چلا جاؤں گا"

میرے سوال کا جواب اس کے پاس تھا" دھوپ تو کل بھی ہوگی لیکن تھوڑی دیر بیٹھ جائیے میں نے ابھی چائے چڑھائی تھی ایک پیالی آپ بھی پی لیجیے"

اس کے بھرے بھرے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ مسکراہٹ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی میں اس کی طرف حیرت سے دیکھتا رہ جاتا ہوں وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پلٹ گئی تھی پھر اچانک کال بیل بج اٹھتی ہے۔ سریلی گھنٹیوں کا ایک مدھر سا شور۔ میں ابھی تک اسی گونج کے پھیلتے ہوئے دائروں کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا کہ نگینہ اندر بھی آگئی۔

"گڈ مارننگ انکل، کیسے ہیں آپ،"

وہ پہلے سے کچھ لمبی نظر آئی شاید اس لیے کہ اسے کافی مدّت کے بعد پھر دیکھ رہی تھی بڑے خوبصورت رنگ کا میچنگ ٹاپ اور اونچی ایڑیوں کے سینڈل ایک ہاتھ میں کتاب اُٹھائے ہوئے تھی دوسرے ہاتھ میں لیے ہوئے گاگلز کو مسلسل گھمائے چلی جارہی تھی۔

"تم، اس وقت، اچانک،"

"مصیبت ہمیشہ اچانک ہی آتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے پھر اپنے سر کو دائیں بائیں دو ایک جھٹکے دیتی ہے اس کی بھاری پونی ٹیل پشت سے سامنے آگرتی، "

پھر فوراً ہی پیچھے جا پڑتی ہے۔ اُس کے خوبصورت سنہرے بالوں کا ایک گچھا دائیں کندھے پر پڑا سا رہ جاتا ہے اور
اب وہ پُرسکون بھی نظر آئی۔ چند ہی لمحوں میں دو سال پہلے کی شرمائی سمٹی ہوئی ایک باوقار حسین بیوہ جیسی ہوگئی۔

"شاید کہیں جا رہے ہیں؟"

"اگر نکل گیا ہوتا تو تم میری میز پر ایک چھوٹی سی تحریر چھوڑ جاتیں۔ خیر سنو اس وقت تمہاری آپی چائے بنا رہی ہیں اندر جا کر اپنے لیے بھی بنا لو۔"

"میں چائے نہیں پیوں گی۔ بہت گرمی ہے ناں!" وہ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ گھوم گئی جلدی سے فریج کے پاس پہنچی "کوئی ٹھنڈی چیز تو ہوگی ہی۔"

اس لڑکی کو کیا ہوگیا ہے آج! ایک لمحے میں کچھ، دوسرے لمحے میں کچھ" میں گردن گھما کر اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ لمکا کا ڈھکن کھٹ سے اُتار کر بوتل اپنے منہ سے لگالی حلق کے اندر ایک ہی گھونٹ اُتارا۔ پھر گھمس کی اور چل دی۔

شادی ہو جانے سے پہلے وہ اسی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی شوخ تھی۔ میں دونوں کو کئی سال سے جانتا تھا ایسے میچنگ خوبصورت جوڑے میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے والے میڈ فار ایچ اَدر اشتہاروں میں بھی نہیں۔ اُن کے ریور میک والے فلیٹ میں کئی ہنگامے دیکھے تھے قہقہوں اور ہاؤ ہو سے بھرپور۔ آج آبگینہ کا برتھ ڈے ہے۔ کل اس کے شوہر کا جسے وہ پیار سے سب کے سامنے ہی "مکھا" کہہ کر پکارتی تھی۔ ایک بڑی تقریب اُن کی شادی کی سالگرہ کی ہوتی تھی۔ بچہ پیدا ہوا تو ایک اور "برتھ ایونٹ" کا اضافہ ہوگیا۔ میری بیوی اور میں اُن کی ہر دعوت میں مدعو رہتے تھے۔ بریانی اور کباب بنانے میں ابھی تک آبگینہ کا کوئی ثانی نہیں ملا۔ چکن، رومالی، قورما، کئی قسم کی آئس کریمیں ــــــ وہ بازار سے منگا لیتی تھی۔ مکھے کو میں نے حضرت گنج سے ہمیشہ لدا پھندا ہوئے آتے دیکھا کئی کئی ڈبوں کے ساتھ۔ گرمیوں میں موسم لگتی تو پکنک اسپاٹوں پر دھاوا بول دیا جاتا۔ سڑکوں پر اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں، جیپوں اور کاروں کا ایک قافلہ سا دوڑا چلا جاتا۔ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوڑ میں تالیاں بھی پیٹی جاتیں۔ اُن کے دوستوں میں چند بوڑھے بھی تھے لیکن وہ بھی دوسرے جوانوں جیسے ہی تھے۔ ہم لوگ کوئی بہانہ بنا کر اپنے گھر سے بھی غائب ہو جاتے تو آبگینہ ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں کے درمیان رہنے سے مجھے ایک ہی اُلجھن ہوتی تھی کہ میں خود کو بے حد بدلا بدلا سا محسوس کرنے لگ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا میری عمر پر لگا کر کئی سال پیچھے چلی گئی ہے

مجھے بے حد خوش اور جھجکتا ہوا پا کر سکنا یہ کہنے سے باز نہیں آتا تھا — "اصل میں آپ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں، ہر آدمی کو اسی عمر میں عشق کرنا چاہیے۔"

اس ہنگامہ میں ایک آنگیہ ہی تھی جو مجھے کسی لمحہ نظرانداز نہیں کرتی تھی۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھ جاتی تھی کہ میں کہاں ہوں، سکون سے ہوں کہ نہیں۔ مجھے ہنستا ہوا پاکر میرے کان میں کہہ جاتی تھی — "آپ کی تحریریں جس طرح ہمارے ساتھ دیتی ہیں، اسی طرح خود بھی اپنے ساتھ رہ کر دیکھیے۔"

میں اُن خوش قسمت ادیبوں میں سے ہوں جنہیں جیتے جی بے شمار قاری مل گئے ہیں۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے اختلاف کرنے والے اور چاہنے والے بھی جو اکثر کہتے ہیں آپ نے ہمیں جینے کا سلیقہ سکھایا۔ میں اُن سے کہا کرتا ہوں، آپ کا اعتماد ہم لکھنے والوں کی قوت ہے اور جب میں آنگیہ کی طرف دیکھتا تھا تو یہ سوچ کر گھبرا جاتا تھا کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے حلقے کے لیے ایک تحریک ہو تو ہو میرے لیے مسرت کا ایک مجسم طوفان کیوں ہے؟ میں اس کے قہقہوں کے تیز تیز بہاؤ کے ساتھ خود کو بہتا ہوا کیوں محسوس کرتا ہوں؟ کبھی کبھی میرے دل میں بے پناہ حسد بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ سب کی دلچسپی کا مرکز کیوں ہے؟ صرف میری کیوں نہیں؟ شاید کئی دوسرے بھی ٹھیک میری ہی طرح اپنے دل میں محسوس کرتے ہوں، میری ہی طرح سوچتے ہوں۔ لیکن ہم سب سے بڑی حاسد ایک اور ہی ہستی نکلی — خود قدرت، جس نے نہ صرف اپنے ہاتھوں سے اُسے نور کے سانچے میں ڈھالا تھا بلکہ اس سے بے پناہ محبت کرنے والا ایک شوہر بھی دیا تھا۔ وہ بھی آنگیہ کو دل دے بیٹھی اور اس کے محبوب کو ٹرک اور اسکوٹر کے حادثے کے بعد میڈیکل کالج کی مورچری میں پہنچا دیا۔ باہر بے شمار سوگواروں کی بھیڑ لگی تھی۔ آنگیہ بھی اسی اسپتال کے ایک وارڈ میں کئی گھنٹوں سے بے ہوش پڑی تھی۔ اُس کے بھی کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن ڈاکٹر پُرامید تھے کہ وہ بچ جائے گی۔ اُسے ابھی تک نہیں معلوم تھا کہ اُس کا شوہر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ دو روز بعد اُسے ہوش میں لایا جا سکا تو اُس کے عزیزوں، دوستوں کے لیے سب سے جانکاہ مرحلہ یہی تھا کہ اُسے حادثے کے المناک انجام کے بارے میں کیسے اطلاع دی جائے کہ کہیں وہ غم سے پاگل نہ ہو جائے۔

لیکن اس نے جب ہر شخص کے چہرے پر ایک گہری پُرسکوت لگی ہوئی دیکھی تو جیسے اپنے آپ ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ مجھے نہیں معلوم اس وقت وہ کس طرح رونے سے چیخ اٹھی تھی یا تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے لیے اس لمحے کی تاب لانا ہی مشکل تھا۔ دوسرے دن میں اس کے گھر گیا تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کس حد تک بدل چکی تھی۔ اُس کی طوفانی زندگی میں جیسے اچانک ایک صبرآمیز ٹھہراؤ آگیا تھا۔ سعید

دھوتی، بکھرے ہوئے بال، سوکھے ہوئے ہونٹ اور کچھ تلاش کرتی ہوئی خالی خالی آنکھیں۔ وہ اپنی ہستی کا سارا خزانہ گنوا بیٹھی تھی لیکن پھر بھی اس حد تک نارمل تھی کہ اپنے بہت سے کاغذات اُٹھا کر میرے پاس آ بیٹھی اور آئندہ زندگی کا جائزہ لینے میں میری مدد چاہی۔ شوہر کا بینک بیلنس ـــــ بیس ہزار روپے۔ پوسٹ آفس میں ٹکس ڈیپارٹ ـــــ پندرہ ہزار روپے ـــــ

جو مزید تین سال کی مدت گزرنے کے بعد دوگنا ہو سکتے تھے۔

انشورنس ـــــ پانچ پانچ ہزار کی دو پالیسیاں

پراویڈنٹ فنڈ ـــــ بارہ ہزار

گروپ انشورنس ـــــ پانچ ہزار

اس نے یہ بھی بتایا ـــــ "اُن کے آفس کے جنرل منیجر آئے تھے انھوں نے مجھے ترس کی بنیاد پر ایک کلرک کی جاب آفر کی ہے کُل ملا کر آٹھ ساڑھے آٹھ سو روپے مل جائیں گے"

میں نے مشورہ دیا ـــــ "فوراً قبول کر لو لیکن فیکٹری بہت دور ہے۔ بہتر ہوگا اُسی کے قریب کوئی مکان تلاش کر لو یا اسکوٹر چلانا سیکھ لو۔"

اُس نے سر جھکا کر کہا تھا ـــــ "یہی کروں گی۔"

اب میں اُسے اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے لکا کی تول اُٹھاتے واپس آتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ کہتی ہے "میرے باس کی ٹرانسفر ہو گئی ہے آئندہ سنڈے اس کا فیئرویل ہے اس موقع پر مجھے ایک نظم پڑھنی ہے کچھ مدد کیجیے ماما"

تیس سال بعد اس کے چہرے پر ایک نئی رونق دیکھ کر میں بہت خوش ہوا کچھ ہفتے پہلے میرے یہاں لندن سے مشہور شاعر احمد فراز آیا تھا اس کا کلام سننے کے لیے تیس چالیس شائقین جمع ہو گئے تھے اُن میں آبگینہ بھی تھی ان سب میں غالباً آبگینہ ہی ایسی شخصیت تھی جس کے لیے احمد فراز نے کچھ کشش محسوس کی تھی۔ اس کی نظریں ہر کہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جس وقت فوٹوگرافر تصویریں اُتار رہا تھا اس نے آبگینہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ "آپ کے ساتھ تو میری ایک تصویر بھی کہیں لی گئی ہے۔"

اسی روز اس تقریب کی تصاویر بھی میرے پاس بھجوائی گئی تھیں جو سامنے میز پر پڑی تھیں آبگینہ کی نگاہ م م اُٹھا اُٹھا کر ایک ایک کر کے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "آج یہ تصاویر لندن بھجوائی ہیں ان کا پیکٹ

ساکر پوسٹ کرا آؤ گی؟"

اُس نے اُداس ہو کر پوچھا۔ "کیا فرار لندن واپس چلے گئے؟"

"ہاں۔" مجھے ہنسی بھی آ گئی۔۔۔۔ "اب وہ ہاتھ نہیں لگے گا، لیکن ایک اور آدمی، اُس سے کہیں زیادہ لکشن اور تعلیم یافتہ میری نظر میں ہے۔"

اُس نے کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔ ایک دو بار بڑی بے چینی سے پہلو بدلا، سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا بھی تو گھبرائی ہوئی نگاہوں سے جیسے میری بے رو پوری سے وہ بہت پریشان ہو اُٹھی ہو۔ بولی۔۔۔ "اب تو میری ساری دلچسپی اپنے بچے میں ہے۔ کون میری طرح اُسے محبت دے سکے گا؟ اُسے میں کسی جذباتی صدمے سے دوچار نہیں ہونے دوں گی۔"

ایک ذمہ دار ماں کو ایسا ہی جواب دینا چاہیے تھا اور جس جذبے کا اُس نے اظہار کیا تھا، وہ بھی صحیح تھا لیکن میں جیسے اپنی تجویز آسانی سے رد نہیں ہونے دینا چاہتا تھا جو اُس کے تحفظ کی مکمل ضمانت تھی۔ بولا۔ "پھر بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہی ایک شخص ہے جو تمہارے بچے کی پوری ذمہ داری اُٹھائے گا لیکن مرد کی شخصیت بھی اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب کوئی عورت سب کچھ بھول کر اُس سے محبت کرے۔"

"اگر میں واقعی ایک آئیڈیل عورت ہوں تو یہ بھی بتا دیجیے کہ اپنی محبت کا ڈراما اُس کو دیکھنے سے پہلے شروع کروں یا بعد میں؟"۔۔۔ یہ کہہ کر وہ بڑی بے تکلفی سے ہنس بھی پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہو کر بولی۔ "اپنی محبت میں اب کسی اور کو شریک نہیں کر سکتی۔ آئی ایم ساری! یوں بھی مجھ پر کسی قسم کا معاشی بوجھ نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں۔"

پھر میرے اسٹڈی روم میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔۔۔ "کوئی اور کتاب لے جانے کے لیے آئی تھی۔ چلیے، جائیے گا کچھ دور تک شہر کا ساتھ میں بھی دوں گی۔"

متبادل

رودری گپتا صبح جاگا تو اس کی یادداشت میں اپنی گلی کا وہ منظر پوری طرح موجود تھا جو اُس نے اس جگہ تیس سال باہر گزار کر لوٹنے کے بعد دیکھا تھا۔ اُس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے یاد کیا ـــــ مہاتما بدھ مارگ اور ایمن آباد روڈ کے درمیانی محلے کے بیچوں بیچ سی ہوئی چھوٹی سی سڑک پر دونوں اور لکڑی کے بے شمار اسٹال کھڑے کیے جا چکے ہیں، جن میں کتابوں، کپڑے دھونے والا صابن، ویلڈنگ، وردی، بسکٹ، ڈبل روٹی، پان سگریٹ، حلوائی، گھڑی ساز، ملٹری کا ڈسپوزل کا سامان، کمبل، تھیلے، پانی کی بوتلیں وغیرہ بیچنے والوں اور کئی بے رنگیا قسم کی مادیں چلانے والوں کی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے مکان کی باؤنڈری وال کے آگے بھی پانچ دکانیں ہیں۔ یہی غنیمت ہے کہ اُن کا چھوٹا سا گیٹ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اُس کے گیٹ کے دائیں طرف ایک چائے کا اسٹال بھی لگا ہوا ہے

چائے کے اسٹال کی یاد آتے ہی اُسے مارننگ ٹی کی طلب محسوس ہوئی اور یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے کل شام کو اسی اسٹال سے چائے منگائی تھی۔

اس نے سر گھما کر ساتھ لگے ہوئے پلنگ کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر نہانے دھونے اور پوجا پاٹھ میں مصروف ہو گئی ہو۔ اُس نے کان لگا کر باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور اس نے وِمَا کو کسی

یاد کیا جو اُس کے ساتھ اورنگ آباد سے آئی تھی۔ اُسے کل رات کو سونے کے لیے ساتھ کا دوسرا چھوٹا کمرہ دے دیا گیا تھا۔ بلکہ اس نے خود ہی اپنے لیے وہی کمرہ پسند کیا تھا۔ وہ بھی صبح بہت جلدی اُٹھ جانے کی عادی تھی۔
وہ اپنا تھیسس مکمل کر کے ان دنوں اُسے ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ اُس نے وندنا کو ایک خوب صورت ٹائپ رائٹر لے دیا تھا۔ لیکن اُسے یاد آیا، ابھی تو ٹائپ رائٹر بکسے میں بند تھا۔ اُسے کھولا ہی کب گیا تھا۔ سارا سامان نئے سرے سے ترتیب دے دیا جائے تب زندگی اپنے معمول پر آئے گی یا نئے معمول کے مطابق شروع ہوگی۔
وہ اُٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وندنا پیٹھ پر تازہ دُھلے ہوئے بال بکھیرے اور دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اُٹھائے اندر داخل ہوئی
"گڈ مارننگ انکل!"
اورنگ آباد میں اُن کا صبح کا یہی معمول تھا۔ وندنا ہی آ کر اُسے نئی صبح کی نیک خواہشات پیش کرتی تھی اور خود ہی چائے بنا کر لے آتی تھی ـــــ البتہ ناشتہ بنانے کی ذمہ داری رامیشوری نے اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ سالہا سال سے۔ جب سے وہ دونوں ریٹائر ہو گئے تھے۔ ایک ہی ٹیبل پر ٹھیک آٹھ بجے مل کر ناشتہ کرتے تھے
"آج گیس سیلنڈر مل جائے گا۔ اوپر والے صاحب نے وعدہ کیا ہے اور اُن کی بیوی نے کام چلانے کے لیے اسٹو اور مٹی کا تیل بھی دے دیا ہے۔"
تھوڑی دیر کے بعد رامیشوری بھی آ گئی۔ پچپن سال کی ڈھلی ہوئی عورت اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے سو سو کے۔ آتے ہی پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ بولی ـــــ "مسز علی نے تین ماہ کا کرایہ دے دیا ہے۔ کہتی تھی چیک سے اس لیے نہیں بھجوایا تھا کہ ہمارے آنے کی خبر تھی۔"
ناشتے سے فارغ ہو کر روی گپتا نے اپنے مکان کی سڑک کا ایک چکر لگایا۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ وہ کتنی دیر تک چرچ گیٹ کراسنگ پر کھڑا رہا۔ تجارتی مرکز کی طرف جانے والی آدمیوں سے لدی ہوئی بے شمار رکشائیں تھیں۔ اِدھر سے آنے والوں کی بھی۔ ہر طرف آبادی ہی آبادی تھی۔ صبح ہوتے ہی دفتروں میں پہنچنے والے بھی جلدی میں تھے۔ سائیکل سوار اور اسکوٹر سوار۔ اسی سڑک پر ایک سبزی کی اور ایک اناج کی منڈی بھی تھی۔ درمیان میں کہیں کوئی ٹھیلا پھنس گیا تھا۔ رکشے والے چیخ رہے تھے۔ پیدل جانے والے بیچ بیچ میں سے راستہ بنا کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دکاندار نے اپنی دکان کا شٹر کھول کر اُسے اوپر سرکاتے ہوئے بتایا ـــــ "یہاں برسوں سے ٹریفک کا یہی رونا ہے۔ دن میں پچاس بار ٹریفک جام ہوتا ہے۔"

کتنے برسوں سے لروی گپتا نے اندازہ لگایا۔ وہ یہاں تیس برس کے بعد لوٹا ہے، تب تو ایسی بھیڑ نہیں
رہتی تھی۔ اُسے وہ زمانہ یاد تھا جب اُس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ وہ کئی روز تک یہاں مقیم رہا تھا پھر والدہ کو
ساتھ لے کر لوٹ گیا تھا۔ مکان کے دونوں حصے کرائے داروں کے حوالے کر کے۔ درمیان میں دو دو تین تین
سال کے بعد ایک آدھ روز کے لیے اس لیے آیا تھا کہ مکان کی مرمت وغیرہ کرانی پڑ گئی تھی اور دو بار کرائے دار بدل
گئے تھے۔

اس نے اسی دکاندار سے ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم، بسکٹوں کے دو پیکٹ، انڈے اور اسکواش کی دو بوتلیں
خریدیں اور اُسے اپنا تعارف دیا اور یہ بھی پوچھا کہ اس کے مکان کے آگے لگے ہوئے لکڑی کے اسٹال کیسے ہٹائے
جا سکیں گے۔

دکاندار جو مغربی پنجاب کا باشندہ تھا۔ آزادی کے بعد وہاں آ کر بس گیا تھا۔ بولا۔ "بہت مشکل
ہے جناب والا۔ کئی سال تک مقدمے بازی کرنی پڑے گی پھر بھی جگہ خالی نہیں کرا پاؤ گے۔ قانون سے زیادہ
قانون کے خلاف لڑنے والوں کے ہاتھ لمبے ہو گئے ہیں اب تو۔ میرے تھڑے پر بیٹھے ہوئے پان بیڑی والے کو
دیکھ رہے ہو۔ یہ چار فٹ کی جگہ خالی کرانے کے لیے مجھے چار سال تک خوار ہونا پڑا۔ چار ہزار روپے بھی وکیلوں
کی جیبوں میں پہنچ گئے۔ پر وہ سسرا وہیں کا وہیں موجود ہے۔"

"اگر میں اپنی باؤنڈری کے اندر اندر پانچ چھ چھوٹی چھوٹی دکانیں بنا لوں تب تو اسٹال والے آگے بیٹھنے
کا حق کھو بیٹھیں گے۔"

"کیسی بات کرتے ہو جناب عالی۔ تب تو ان کے وارے نیارے نہیں ہو جائیں گے؟ اگر کچھ چھوڑ
بھی دیں گے تو خاصی لمبی پگڑی لے کر۔ بہت سے ناجائز قبضہ کرنے والوں نے تو یہی دھندہ اپنا رکھا ہے۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا اپنے مکان پر واپس آیا۔ ایک طویل مدت سرکاری سروس
کرتے کرتے گزار دی تھی۔ لوگوں کے رسوخ کے گر بالکل نہیں جانتا تھا۔ کچھ روز کے بعد اس نے ایک دن
وندنا سے ایک لیٹر ٹائپ کر دینے کو کہا — جو اس نے ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے نام لکھا تھا۔ لیٹر
پوسٹ کر کے وہ روزانہ اس کے چھپنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن صبح سویرے اخبار میں چھپا ہوا اپنا نام
دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ وندنا سے بڑے پُرجوش لہجے میں بولا — "اب دیکھتا ہوں یہ لوگ یہاں سے
کیسے نہیں ہٹیں گے۔ میرے لیٹر کا تماشا اوپر کے افسروں تک پہنچے گا تو وہ خود حرکت میں آ جائیں گے۔"

کوئی معمولی بات تھوڑی ہے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرلینا۔"

وندنا بولی ۔۔ "لیکن وہ لوگ تو کارپوریشن کی زمین پر قبضہ کئے ہوئے ہیں"

"ہاں، وہ کارپوریشن کی زمین سہی ۔۔ پر کارپوریشن کس کی ہے ؟ وہ بھی تو شہریوں کی ملکیت ہے اس طرح تو ہر شخص کو حق ملنا چاہیئے، وہ جہاں چاہے قبضہ کرکے بیٹھ جائے ۔"

وندنا بولی ۔ "کارپوریشن کو بھی قانون کا سہارا لینا پڑے گا اور آپ ہی کہتے ہیں، قانون بہت ڈھیلا ہے لڑتے لڑتے کئی برس لگ جاتے ہیں ۔"

"ٹھیک ٹھیک ہے ! کوئی کارروائی تو شروع ہو، یہاں تو کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا"

"کیسے کوئی نوٹس نہیں لیتا ! مجھے معلوم ہوا ہے کارپوریشن والے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے سارے دکانداروں سے ایک ماہانہ وصول کرکے لے جاتے ہیں یعنی جن کو آپ قانون شکنی کے لیے متوجہ کر رہے ہیں وہ خود اس دھاندلی کے حصے دار بنے ہوئے ہیں ۔"

معلوم ہوتا تھا وندنا اس مسئلے کے سارے پہلوؤں سے واقف ہو چکی تھی یوں بھی وہ بے حد ذہین تھی۔ اس کے ساتھ کئی موضوعات پر بحث کرنے میں روپ گپتا کو خاص لطف حاصل ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ خود ہی کوئی بحث چھیڑ بیٹھتی تھی اُسے بھی اس گھر میں روپ گپتا کی ہی وجہ سے بڑی دل چسپی محسوس ہوتی تھی

کئی سال پہلے اورنگ آباد میں جب مراٹھواڑہ یونیورسٹی کا نام بدل کر اُسے بی آر امبیڈکر سے موسوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہاں ہریجنوں اور شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کے خلاف بڑے خونریز فسادات برپا ہو گئے تھے ان کی کئی بستیاں جلا دی گئیں تھیں اور کتنے لوگوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے وندنا اسی زمانے میں اُن کی پناہ میں آگئی تھی اس کے ماں باپ دونوں مار ڈالے گئے تھے۔ اس کا باپ روپ گپتا کے دفتر میں چپراسی تھا جو اُسے ایک ہائی اسکول میں پڑھا رہا تھا گپتا نے نہ صرف اس کی تعلیم جاری رکھی بلکہ اس کی تربیت میں بھی خاصی دلچسپی لی وہ اپنی کلاس میں سب سے ذہین لڑکی تھی۔ ہر امتحان میں فرسٹ آتی تھی اور یہ بات ان لوگوں کے اس نظریے کو غلط ثابت کر رہی تھی جو کہتے تھے کہ شیڈولڈ کاسٹ والے بڑے کند ذہن ہوتے ہیں وندنا پی ایچ ڈی کرے گی تو پورے ملک میں وہ ایسا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی شیڈولڈ کاسٹ لڑکی ہوگی لیکن ان کے ساتھ رہتے رہتے اُس کی ذات پر ایک پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ ان ہی کے خاندان کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ لوگ بھی یہی سمجھتے تھے وندنا

بھی خود کو دہی طور پر اسی گھر کا ایک فرد سمجھنے لگی تھی

کئی ہفتوں تک جب کارپوریشن کے حکام نے رودی گپتا کے مکان کے سامنے سے ناجائز قبضہ داروں
کو ہٹانے کے سلسلے میں کچھ نہ کیا تو ایک روز وندنا اور وہ کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر سے جاکر ملے اُس نے
اخبار میں چھپے ہوئے اس خط کے بارے میں بالکل لاعلمی کا اظہار کیا اس کے علاوہ اُس نے بتایا کہ اس وقت
اس کی فائل پر پورے شہر میں دس ہزار سے زائد ناجائز قبضوں کے بارے میں اطلاعات موجود ہیں۔ قانون کے
مطابق کارروائی ہوتی ہی رہتی ہے لیکن اس میں بڑا وقت لگتا ہے شہریوں کو خود ذمہ دار ثابت ہونا چاہیئے۔
وغیرہ وغیرہ۔

اس شہر میں شہری سطح پر یہ اس کی پہلی شکست تھی اُس کی افسردگی میں وندنا بھی شریک تھی لیکن اس
کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ اگر اپنے مکان کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ پانچ دکانیں بنا لیتا تو ان
کے اُوپر بھی ایک شاندار فلیٹ بنایا جاسکتا تھا اور اس کے باوجود لان کے لیے خاصی بڑی زمین بچ رہتی تھی۔
ان دکانوں اور فلیٹوں سے ملنے والے کرائے سے اُن کی زندگی بڑے مزے سے گزر سکتی تھی اگرچہ اُس
کی پنشن اور وندنا کی فکسڈ ڈپازٹس کی رقمیں کم نہیں تھیں۔ لیکن سروس سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد جیسے
اس کے اندر زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی حرص بڑھ گئی تھی ایک مدت تک وہ دفتری فائلوں میں
کھویا رہا تھا۔ اُن سے نجات پاکر اس کے ہاتھ یہ نیا مشغلہ لگ گیا تھا

اس کے علاوہ بھی اس کے کچھ مشاغل تھے جو اُسے بیکار نہیں بیٹھنے دیتے تھے دن میں ایک دو گھنٹے
کے لیے وہ وندنا کے ٹائپ شدہ مسودوں پر نظر ثانی تو کر ہی لیتا تھا، صبح سویرے وندنا کو ساتھ لے کر
مارننگ واک کے لیے بھی نکل جاتا تھا اگرچہ گنجان آبادیوں سے نکل کر کھلی سڑکوں پر پہنچنے کے لیے کافی
وقت لگ جاتا تھا ایک دن اسی طرح ٹہلتے ٹہلتے اُسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ اُس نے اپنے محلے کے
پورے علاقے کا کئی روز کی محنت کے بعد نقشہ تیار کیا چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی گلیاں اور سڑکیں اور
مکانوں کے سلسلے دکھائی۔ اس طرح اُس کے سامنے پورا کا پورا محلہ پھر سے آموجود ہوا۔ لوگوں سمیت وہ
انھیں اسی طرح چلتا ہوا، رینگتا ہوا اور ایک دوسرے سے جھگڑتا ہوا محسوس کرنے لگا اور وندنا کو بلا کر کہنے
لگا۔ "ہماری سوسائٹی اپنی ساری خامیوں اور برائیوں سمیت اس شیٹ پر اُتر آئی ہے۔
ذرا غور سے دیکھو اب ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اس بیماری کی جڑ کہاں ہے؟ آبادی کی کثرت اور

غلط منصوبوں نے انہیں دہری طور پر کیوں مفلوج کر رکھا ہے ۔۔۔ اس کے لیے ہم ہی تو ذمہ دار ہیں ایسے مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر انہیں دور بھی کر سکتے ہیں "

"وہ کیسے ؟" ودما نے نقشے پر جھکے جھکے پوچھا۔

"اس طرح ۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک سرخ پنسل سے اس نقشے کی ازسرِ نو ترتیب دی کچھ گلیوں اور سڑکوں کو چوڑا کر دیا اور کہا ۔۔۔ یہاں یہاں ، سارے مکان گرا دیئے جائیں گے اور یہاں چھ منزل اسٹوریڈ مکان ہیں انہیں بھی گرا کر کئی کئی اسٹوری کی بلڈنگ بنا دیا جائے گا اور اس سبزی منڈی اور اناج منڈی کو شہر کے باہر کسی دوسری جگہ پر شفٹ کر دیا جائے گا تاکہ یہاں خریداری کرنے کے لیے آنے والے ہزاروں لوگ ان سڑکوں پر آئیں ہی نہیں اس طرح سڑکوں پر جو اکثر ٹریفک جام ہو جاتا ہے ، پھر کبھی نہیں ہوگا "

ودما اپنی ہنسی روک کر بولی ۔۔۔ "پھر ؟"

"پھر کیا ! ۔۔۔ اس محلے کو صرف ایک بار گرا دینے کی دیر ہے سارے پرابلم حل ہو جائیں گے تم نے دیکھا ہے ہمارے محلے میں ایک بھی پارک نہیں ہے ۔ بچے بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں پر اور گلیوں میں کھیلتے ہیں اور آئے دن ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں "

"لیکن یہ سب کیا آپ کر سکتے ہیں ؟" ودما نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہیں" ! میں اتھارٹیز کو لیٹر بھیجوں گا اپنا پورا پلان بھیجوں گا اُن سے جا کر ملوں گا تم بھی میرے ساتھ رہنا ، ہم دونوں مل کر انہیں سمجھائیں گے "

روی گپتا کئی روز تک ایک اور نقشہ بھی تیار کرنے میں لگا رہا ۔ جس میں کھلی کھلی سڑکیں تھیں ۔ پارک تھے ، کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا ایک ویران اور سنسان جگہ پر ہی ایک مکمل نیا شہر تعمیر کیا جانے والا ہے جس کی تمام تر ذمہ داری صرف اسی کو سونپ دی گئی ہے ۔

ایک روز وہ صبح سویرے اپنی بیوی کو خوشی خوشی اپنے پلان کے بارے میں تفصیل سے سمجھا رہا تھا ۔ اور اُسے یہ باور کرا رہا تھا کہ ہماری بہت سی مشکلات اسی ذریعے سے حل ہو جائیں گی کہ اچانک ودما باہر سے تازہ اخبار اُٹھا کر لے آئی اور ایک صفحے پر چھپی ہوئی خبر سناتی ہوئی بولی ۔۔۔ "لیجیے انکل ! ابھی آپ نے اپنا پلان بھیجا بھی نہیں کہ کارپوریشن نے خود ہی ایک ایسا پلان بنا لیا ہے ہمارے ہی محلے کی شکل و صورت بدل دے گا ۔"

روی جلدی جلدی وہ خبر پڑھنے لگا جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی چھپا ہوا تھا۔ اس نقشے میں کچھ مکانوں کو اپنے قبضے میں لے کر کارپوریشن نے ایک نیا پارک بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ بھی اعلان کیا تھا کہ جس کے مکان نقشے میں لیے جائیں گے انہیں شہر کے باہر اُن کے معاوضے میں آدھی دوکاس کے مکان دیئے جائیں گے ـــــ اسی نقشے میں روی گپتا کا بھی مکان آ گیا تھا۔

وہ بالکل سناٹے میں آ گیا کئی لمحوں تک بالکل بول ہی نہ سکا۔ وندنا اور رامیشوری حیرت سے اس کی طرف تک رہی تھی ـــــ روی گپتا نے اپنی خاموشی سے نکلتے ہوئے کہا۔ "صرف چند مکانوں کو گرا دینے سے کیا ہوگا۔ میرا پلان تو سارے محلے کو گرا کر نئے سرے سے بنانے کا تھا۔ میں بھی ایسا نقشہ لے کر ایڈمنسٹریٹر کے پاس جاتا ہوں۔ یہیں بنے گا تو پھر ہمیں نئی جگہ جانا ہی پڑے گا اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔"

کیسے کیسے لوگ

تھوڑی دیر پہلے وہ میرے ہاتھ سے بیئر کا گلاس قبول کر چکی تھی، اور سگریٹ پیتے وقت اُسے کھانسی آ گئی تو اُس نے کہا

"اس سے پہلے میں نے کبھی 'اسموک' نہیں کیا تھا اور شراب بھی کبھی نہیں پی تھی"

"لیکن یہ تو بیئر ہے اگرچہ کچھ "اسٹرانگ" ہے، لیکن بعض عورتیں محض ساتھ دینے کے لیے سائیڈر پی لیتی ہیں جو بہت ہی لائٹ ڈرنک ہے۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی۔ میں نے پہلے کبھی اس قسم کی چیز نہیں پی۔"

"چیر ہٹائیے اس بحث کو یہ بتائیے، کیا آپ نے سوچا تھا کبھی، ہماری ملاقات اس طرح اچانک ہو جائے گی ــــ گھر سے سیکڑوں میل دور، ایک قصبے کے ایسے بازار میں، جس کی صنعت کی کوئی روایت موجود نہیں ہے سارا مال باہر کی منڈیوں سے لا کر بیچا جاتا ہے۔"

"نہیں، یہ تو واقعی کبھی نہیں سوچا تھا، لیکن جب آپ کو ساڑیوں کی دکان کے اندر جاتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ بنگال کے رہنے والے ہرگز نہیں ہیں۔ میں یہاں ایک ہفتے سے رہ رہی ہوں، ہر روز صبح شام بے مقصد گھومنے کے لیے دو میل پیدل چل کر آتی ہوں۔ ایک روز معلوم ہوا باہر گاؤں میں ایک میلا لگتا ہے۔ اس جگہ سے دس میل دور ہے اور وہاں بھی پیدل ہی جانا ہوتا ہے کیونکہ

وہاں پہنچنے کے لیے نہ سڑک ہے نہ کوئی سواری۔ ہزاروں دیہاتیوں کو ٹولیاں بنا کر پگڈنڈیوں پر ایک دوسرے کے پیچھے ایک ہی لیک میں چلتے ہوئے دیکھا سب کے سب اپنی بھاشا کے گیت گاتے ہوئے وہاں میں نے باؤلوں کو جو ایک طرح سہارے لوک گوی ہوتے ہیں، لوگوں کی بھیڑ کے درمیان اکتارا یا کھنجری بجا بجا کر محض گاتے ہوئے سنا۔ کیا آپ نے بنگال کے دیہاتی دیکھے ہیں جو شہر یا قصبہ میں رہنے والے دیہاتیوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کالے کالے ننگے بدن، نچلے حصہ پر چھوٹی سی رنگین دھوتی یا گمچھا لپیٹے ہوئے اور اُن کی عورتیں انہی کی طرح کالی لیکن بہت ہی دلکش ناک نقشہ والی، سر کے بال اتنے لمبے لمبے کہ گھٹنوں سے نیچے نیچے پہنچتے ہیں وہ انہیں کھوپرے کے تیل میں بسا کر بہت چکنا اور چمکدار بنا لیتی ہیں۔

ایک دن چلیے میرے ساتھ۔ میں پتہ لگا کر آؤں گی پھر کس روز میلا لگے گا لیکن ـــ آئی ایم سوری، میں اتنے روز تک یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"کیوں؟ ایسی کیا پرابلم ہے، کیا گھر لوٹنے کے لیے جی چاہ رہا ہے؟"

"گھر تو ضرور لوٹ جاؤں گی کبھی نہ کبھی لیکن یہاں لڑکیوں کے ہاسٹل میں ایک لڑکی کی گیسٹ بن کر رہ رہی ہوں جس کے ساتھ کلکتہ سے آتے ہوئے اچانک دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے مہمانوں سے ملنے والے کمرے میں صرف رات کے وقت ٹھہرانے کی اجازت لے رکھی ہے۔ ایک ہفتہ تو ہو چکا ہے میں کب تک اُسے پریشان کر سکتی ہوں یہ بھی تو سوچتی ہوں۔"

دوسرے دن وہ میرے ساتھ رہنے کے لیے ٹورسٹ لاج میں منتقل ہو گئی۔ دن بھر ہم پیدل کئی دیہات میں گھومتے پھرے۔ یہ میرے پیشے کے برعکس ایک نیا تجربہ تھا ورنہ عام طور پر میں ریلوے اسٹیشنوں پر اور تجارتی منڈیوں میں ہی جا کر اپنا کام پورا کر لیتا تھا اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ جیسا کچھ دیکھ لیا ہے وہ بھی ہندوستان ہی تو ہے۔ لیکن میرا چودھری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو دیکھا، گاؤں کے بانس، جوٹ اور دھان کے کھیتوں اور جنگلی گھاس سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گذرا اور بے شمار حسرت زدہ اور ضرورت مند آنکھوں کو اپنی طرف گھورتا ہوا پایا تو میرا جی چاہا کچھ دن انہی لوگوں کے درمیان رہ کر سمجھا جائے

دوسروں کے طرز زندگی کا مطالعہ کرنا اور اُن کے مسائل کو جاننا میرا ایک محبوب مشغلہ رہا ہے لیکن میرا چودھری نے میری اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ بولی۔

ممکن ہے کوئی ہمیں مہمان سا نا قبول نہ کرے۔ اُن کے دل میں ہماری طرف سے ایک ڈر بھی تو پیدا ہو سکتا ہے۔ انتہائی طور پر پسے ہوئے اور مفلس دیہاتیوں کی فطرت سے آپ واقف نہیں ہیں ہمیں رات بسر کرنے کے لیے کسی بہتر آدمی کو تلاش کرنا پڑ جائے گا جو دوسروں کی نسبت اچھا کھاتا پیتا ہو۔ پھر اس کا فائدہ ہی کیا؟ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ ہم ٹورسٹ لاج میں رہ کر ادھر اُدھر گھوم لیا کریں کچھ دن بعد کسی اور طرف چل دیں گے۔"

یہ سُن کر میری ہنسی چھوٹ گئی "یہ آپ نے کیسے تصور کر لیا کہ میں آپ کے ساتھ جگہ جگہ گھوما پھروں گا؟"

"ساری" یہ کہہ کر وہ کئی منٹ تک خاموش سی کھڑی رہ گئی۔ ہم ایک پوکھرے کے کنارے کئی فٹ اونچی جنگلی پام کی ایک ہری بھری جھاڑی کے سامنے کھڑے تھے پام کے چوڑے چوڑے پنکھ ہلکی ہلکی ہوا سے جھوم رہے تھے پوکھرے کے گہرے نیلے پانی کی سطح پر کنول کے بیشمار پھول تیرتے پھرتے تھے کنارے کنارے سفید اور اودے رنگ کے پھولوں والی خودرو جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جن کا عکس پانی میں بھی پڑ رہا تھا لیکن ان مسحور کن نظاروں میں خود کو دیر تک محو نہ رکھ سکا کیونکہ اُس کی خاموشی میرے من کو بُری طرح ڈس گئی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایک لمحے سے زیادہ نہ دیکھا گیا وہ مجھ ہی پر اپنی نظریں جمائے ہوئی تھی۔

"اگر آپ واقعی یہی چاہتی ہیں تو پھر مجھے آپ کے ساتھ گھومنے پھرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے"

"نہیں نہیں، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی میں نے تو کچھ دنوں کے لیے اپنے آپ کو فطرت کے حوالے کر دینے کے لیے ہی اسباب کچھ تیاگ سا دیا تھا آپ نہیں ملے تھے، تب بھی تو گھوم رہی تھی اکیلی۔ اب بھی اکیلی گھوم لوں گی مجھے ڈر کس بات کا ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں واقعی بے خوفی کی جھلک تھی لیکن اس کا لہجہ سراسر شکایت سے لبریز تھا چند دنوں کی رفاقت ہی نے ہمارے درمیان اتنی قربت پیدا کر دی تھی کہ اب وہ اس قسم کا شکایتی لہجہ اپنانے کا پورا حق رکھتی تھی میں نے سوچا اگر اس نے میری خواہش کو ٹھکرا کر میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہوتا تو میرے اندر وہی رنج یا صدمے کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔

انہی لمحوں میں مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ دو انسان کسی فطری جذبے کے تحت ہی اس طرح ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ اس فاصلے کے باوجود انہیں اس قدر نزدیک لا کر بھی دور رکھے ہوتا ہے من

نے تو ابھی تک اُس سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی، کب سے منسلک رہی تھی، اُس نے بھی اس قسم کا کوئی سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا۔ بس ہم ایک دوسرے کے نام جانتے تھے اور ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند بھی اور یہ حقیقت بھی کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنا بہت اچھا لگ رہا تھا

میں تھوڑی دیر کے لیے پام کے سائے میں گھاس پر بیٹھ گیا اس سے کہا "آپ بھی بیٹھیے کچھ دیر سستا لیا جائے!"

وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی سر کے کھلے ہوئے بالوں کو اُس نے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر لپیٹا اور پھر گردن کے پیچھے ایک دلکش جوڑے میں سمیٹ دیا میں اُس کے اُوپر اُٹھے ہوئے بازوؤں کے نیچے اُس کی لمبی گردن اور جسم کی دوسری گولائیوں کو دیکھتا سا رہ گیا کوئی بھی عورت ہر وقت دلکشی کا پیکر نہیں ہوتی وہ خاص خاص لمحوں ہی میں ایسی دکھائی دیتی ہے میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"لائیے، ذرا آپ کا ہاتھ دیکھوں۔"

میں نے خود ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا جسے اُس نے واپس نہیں کھینچا تھا۔ کچھ دیر تک اُس کی ہتھیلی کی گہری لکیروں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا ایک دو بار اپنے ہاتھ سے مَل مَل کر ان لکیروں کو صاف بھی کیا ـــــ اور پھر کہا "آپ کی جدائی لکیر تو بہت ہی واضح ہے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کسی سے بہت ٹوٹ کر محبت کی ہوگی لیکن محبت کے معاملے میں آپ حد سے زیادہ حساس ضرور ہیں ـــــ اور ـــــ یہ لکیر آپ کے دل کی ہے اور یہ بہت لمبی عمر کی، یعنی آپ دادی نانی بن کر زندگی سے رخصت ہوں گی ـــــ اور"

آگے کچھ کہنے سے پہلے میں نے اس کی طرف دیکھا تو اُسے اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی طرف عجب نظروں سے گھورتے ہوئے پایا ـــــ اُن نظروں میں ویسی ہی مسیحائی بھی تھی اور ایک طرح کی بہت ہی موہوم مسکراہٹ کی جھلک بھی ـــــ مجھے خاموش پا کر بولی "اور بھی کچھ بتایئے!"

"بس اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا" لیکن میں نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا جسے میں گھما گھما کر دیکھتا رہا "تمہارے بچے بہت ہیں ہارٹ جانے کا بھی پتہ چلتا ہے شاید جاگتی ہوں!"

یہ سن کر وہ ہنس پڑی۔ یک یک خوش اور بے تکلف ہو گئی پہلے کی طرح پھر میرے قریب کھسک آئی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ ۔ میں نے کر لی "تھوڑی سی ودیا میں بھی جانتی ہوں دیکھیے یہ

آپ کی ہارٹ لائن ہے بہت مضبوط ارادے کے آدمی ہیں آپ۔ اور یہ لائف لائن۔ آپ کی عمر بھی کم نہیں ہے حساب، بالکل بوڑھے عظیم ہو کر جائیں گے اس فانی دنیا سے جسے آپ ریٹائرمنٹ کا نام دے رہے تھے۔ آپ کی جذبات کی لائن جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے یعنی آپ ہمیشہ ایک کشمکش میں بھی مبتلا رہتے ہیں مگر آپ کے اندر ایک فیصلہ کرنے والی طاقت موجود ہے۔"

پھر میرے ہاتھ کو ادھر اُدھر گھمایا۔ چھوٹی چھوٹی لکیروں کو اپنی ساڑی کے پلو سے صاف کیا اور بہت غور سے دیکھتی ہوئی بولی:

"دو تین بچے بھی ہیں شاید ہو بھی چکے ہوں مارے جانے کا بھی چکر نظر آتا ہے ـــ لیکن اپنے بارے میں سب کچھ جان کر ہم خوش کیوں ہو اٹھتے ہیں کبھی یہ سوچا آپ نے؟"

"اس وقت تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم دونوں بہت ریکھا وگیان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے بس ایک دوسرے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر ہی ایک عجیب سا سکھ حاصل کر رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا لیکن میری طرف بڑی متوجہ نظروں سے بھی دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اچانک جو سُرخی نمودار ہو گئی تھی وہ مجھے بہت اچھی لگی ـــ پچاس کے قریب پہنچی ہوئی ایک عورت ـــ جس کے جسم کا گوشت کہیں سے ابھی تک نہیں ڈھلکا تھا اور اس کی وجہ سے اس کی عمر کے دس پندرہ برس کم ہو گئے تھے۔

اسی شام کو جب ہم اپنی قیام گاہ کے آرام دہ کمرے میں واپس جا چکے تھے، وہ ایک صوفے پر سر رکھے اور آنکھیں بند کیے مجھے سنا رہی تھی ـــ "میں نے ایک روز اچانک صرف اپنے لیے جینے کا فیصلہ کر لیا میرے دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی بیٹی سب سے بڑی ہے۔ ہوٹل مینیجمنٹ کا کورس پورا کر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں سروس کر رہی ہے۔ ایک بیٹا جرنلسٹ ہے دوسرا بیٹا آکاش وانی میں جو سرا کیپر ہے ابھی کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ میں دراصل ان پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسنا چاہتی انتظار کر رہی ہوں کہ وہ کب اپنے اپنے پارٹنر کے بارے میں مجھے اطلاع دیتے ہیں وہ مجھے اطلاع دیے بغیر بھی شادی کر لیں گے تو میں بُرا نہیں مانوں گی۔ یہ ایک طرح سے اُن کا مجھ پر احسان ہی ہو گا کہ میں بہت سارے سماجی جھمیلوں سے بچ جاؤں گی ـــــــ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں جب ممبئی میں اپنی مٹی سے مل کر لوٹ رہی تھی تو میرے دل میں اچانک ایک اُمنگ اٹھی۔ میں گھر کیوں جاؤں

جاؤں، اور گھر جاؤں بھی کہاں، شوہر کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ بچے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں خالی مکان اب مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے، کیونکہ وہاں میرا کوئی انتظار نہیں کر رہا ہے۔ بس ایک معمول ہے کہ صبح اُٹھ کر اپنے لیے ناشتہ تیار کروں، جھاڑو لگاؤں، غسل خانے میں نہانے کے لیے گھسوں تو چند ایک میلے کپڑے بھی دھو ڈالوں، پھر جی چاہے تو لکھنے پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤں یا آنگن کے بیچوں بیچ جو دیوار کے اس پار کی آوازیں سنا کروں وہاں میری نوڑھی سوت رہتی ہے اور اس کے پانچ بچے۔ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ اس نے میرے ساتھ شادی کی تو وہ پچاس سال سے اُوپر کا ہو چکا تھا۔ تب میں صرف پندرہ سال کی تھی۔ کچھ ایسے ہی حالات تھے۔ جو نہیں جانتے تھے وہ اُسے میرا پاپا سمجھ بیٹھتے تھے جس پر وہ بگڑ جاتا تھا لیکن میں خوب ہنستی تھی ــــ ا ــــ اس تکلیف دہ اور طویل داستان کا آخری حصہ یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ لیکن میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا کہ اپنی آزادی کے لیے کبھی ایسا بھی کر سکوں گی دوسری شادی کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاتی، جو اپنے باپ کے وقت جانے بڑے ہو چکے تھے۔ میں یہی بیٹھے دیکھتی رہی کہ وہ اپنا اپنا گھر آباد کر لیں تو میں ذرا سکون کی سانس لوں بچوں کو بڑا کرنا، اُن کی تعلیم و تربیت میں پوری دلچسپی لینا اور یہ دیکھتے رہنا کہ ان میں سے کوئی بگڑ وگڑ تو نہیں رہا ہے، بہت مشکل کام ہے میں واپسی پر اچانک اٹارسی اسٹیشن پر اتر گئی وہاں سے ناگپور گئی، پھر حیدر آباد اور مدراس اور آخر میں کلکتہ اور کلکتے سے شانتی نکیتن چلی آئی اس طرف کوئی لودھ وہار ہوتا تو میں وہیں چلی گئی ہوتی لیکن یہ جگہ بھی مجھے اچھی لگی سو یہاں سایاں نے بھی یہی کہا تھا۔ ابھی واپس مت جاؤ۔ ہماری یونیورسٹی کا ماحول بھی دیکھتے جاؤ۔ جس کے سانے والے روئیدر تھا کرتے۔ اس نے مجھے اپنے ہوسٹل میں گیسٹ سا لینے کی آفر بھی دے دی تھی ــــــــ پھر ایک روز آپ مل گئے!"

"میرے مل جانے پر آپ کو واقعی کچھ خوشی محسوس ہوئی تھی؟"

"نہیں، بہت زیادہ ہرگز نہیں، بس تھوڑی سی یہ سوچ کر کہ دیکھوں، یہ آدمی کیسا ہے، جسے میں نے پہلے اُس کی پشت سے دیکھا دھیرے دھیرے چلتا ہوا۔ میں بھی اُسی شاپ کے اندر جا کر اس کے سامنے گئی تو اُس نے میری طرف کچھ عجیب طرح سے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے کیا میں اکیلی ہوں، کسی ساتھی کی تلاش میں ہوں، کیا میں اُس کے ساتھ کہیں بیٹھ کر باتیں کرے

کرنے تیار ہو سکتی ہوں، مجھے ایسا ہی لگا تھا آپ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر اور یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر آپ نے میری طرف ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ ہر انسان کی چھوٹی چھوٹی اور سیدھی خواہشیں ہیں جو بہت ہی سرل اور معصوم ہیں۔ انہیں پورا کرنے کے لیے وہ مجبور ہو جاتا ہے تو اس کی افسردگی بڑھ جاتی ہے۔ زندگی یوں بھی اُسے قدم قدم پر افسردہ بناتی رہتی ہے"

"وہ کیسے؟" وہ پہلی بار کھل رہی تھی، ایک کتاب کی طرح اور اپنے آپ

"دیکھیے نا، آپ کے ساتھ چند دن رہ لینے کے باوجود دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہا۔ ایک خوف محسوس ہوتا رہا کہ آپ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟ میں ایک عورت تو ہوں ہی۔ اس بات کو میں کبھی نہیں بھول سکتی خاص کر ان لمحوں میں جب آپ کے ساتھ بالکل تنہا ہو جاتی ہوں۔ میں عورت مرد کی مساوی ضرورتوں کی بات نہیں کرتی، جس کا ہم سب کو پاس کرنا چاہیے لیکن آدمی کی سحر ایک جانور کی ہی بھی تو ہے نا، معاف کیجیے گا،" وہ زور سے ہنس پڑی۔

"کون سا جانور؟ میرا مطلب ہے جانور بھی تو ایک قدرت کا غلام ہوتا ہے۔ جیسا وہ بنایا گیا ہے ویسا ہی وہ کام کرتا ہے لیکن میرا خیال ہے جانور بہت ہی سیدھا اور شریف جاندار ہوتا ہے۔ اپنی میٹ (MATE) کی طرف راغب ہونے کے لیے قدرت نے اس کے لیے خاص موسم مقرر کر دیے ہیں۔ اُن کے علاوہ وہ کبھی اس کے پاس نہیں پھٹکتا جب کہ مرد ہر موسم کا جانور ہوتا ہے۔ معاف کیجیے گا لفظ جانور کا استعمال ہم انسان لوگ کس قدر غلط کرتے ہیں جب کہ لفظ انسان ہی درندگی اور وحشت کی علامت ہونا چاہیے —— لیکن آپ نے اپنی بات خوف سے شروع کی تھی۔ کیا آپ سمجھتی ہیں صرف مرد ہی خوفناک چیز ہوتا ہے؟ عورت کبھی نہیں؟"

"مردوں کی دنیا میں زیادہ تعداد خوفناک مردوں کی ہے۔ ایسی عورتیں بہت کم ہوں گی،" وہ تھوڑی سی مطمئن بھی نظر آئی کہ اس نے ایک سنجیدہ بحث چھیڑ کر میرے اندر توازن پیدا کر دیا تھا

میں نے توازن ہی کو ایک موضوع بنا کر کہا

"آپ ہی دیکھیے، اس ہوٹل کے رجسٹر میں مرد کے ساتھ ایک بیوی کا نام ہے۔ ایک مرد دوست کا بھی ہو سکتا ہے لیکن کسی عورت دوست کا ہرگز نہیں۔ ہمارا سماج یہ بات فرض بھی نہیں کرنا چاہتا کہ کوئی مرد اپنے ساتھ ایک دوست عورت کو بھی لے کر آ سکتا ہے۔ مجھے بھی مجبوراً جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ جب کہ

میں اب تک ہم دوست ہی ہیں۔ ہمارے دروازے اور کھڑکیاں بند دیکھ کر باہر والے یہی سمجھ کر مطمئن ہیں کہ ہم وہی کچھ کر رہے ہوں گے جو میاں بیوی کے وائض میں شامل ہے لیکن ہم کتنی سنجیدہ باتوں میں مصروف ہیں۔ ــــــ "

"لیکن میں باہر والوں سے انتقام لینے کے لیے خود کو آپ کے حوالے نہیں کروں گی۔" اُس نے قہقہہ لگا کر کہا اور دیر تک ہنستی رہی۔

"میرا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ آپ کو کسی نفسیاتی جنگ میں مبتلا کرتا۔"

٭

اگلی صبح وہ مجھ سے پہلے ہی جاگی اور میرے لیے چائے منگوا کر مجھے بھی جگا دیا۔ بولی۔ "میں نہانے سے پہلے چائے نہیں پیوں گی۔ اچھا، جب تک آپ چائے پئیں میں تیار ہو کر آجاتی ہوں۔"

ناشتہ کرنے کے لیے ہم ڈائننگ ہال میں گئے وہاں خلاف معمول کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بنگالی بھاشا میں تیز تیز گفتگو کر رہے تھے۔

اے گنگولی دا، شونو، تمرا ایسی بھومک دا ایک بارے پرانے کپڑے دیے چھے۔ رتی پرٹ دیکھے بولے چھے، ایدستب جو لیے با؟" لمبے لمبے بالوں والی لڑکی جس نے یہ جملے بڑی شوخی سے کہے تھے اس کے جواب میں ایک درمیانے قد کا خوش شکل نوجوان بولا:

"ہاں ہاں آمی جانی کنتو اپنیا امار بھالو ایکٹنگ ہوتے چھے بولی کپڑے گئے چھے۔ یہی کارن بھومک دا سے جانے ہے امار بھالو ایکٹنگ اے جا ایک فلما میں کاہی نکتے جاتے۔"

اُن کا ڈائیلاگ سن کر وہاں جتنے لوگ تھے زور زور سے ہنسنے لگے۔

ان لوگوں کا بندھا ہوا سامان دیواروں کے ساتھ ساتھ رکھا ہوا تھا بڑے بڑے سوٹ کیس، اٹیچی اور بریف کیس اور کچھ بڑے بڑے کیمرے بھی معلوم ہوتا تھا کہ کی ایک فلم کمپنی کا پورا یونٹ شوٹنگ کرنے آیا تھا اُن کی دو موٹریں، ایک جیپ اور ایک وین ٹورسٹ لاج کے احاطے میں کھڑی دکھائی دیں ــــــ

مقامی ایجنسی کے باغات اور گرد و پیش کے نواح بنگالی فلموں کے لیے ایک آئیڈیل میسٹ پلیس مستقل مہیا کردیتے ہیں۔ یوں بھی کلکتہ وہاں سے بہت دور نہیں ہے کم خرچ بالا نشیں۔

جب تک ہم ناشتہ کرتے رہے فلم یونٹ کا ایک بھاری بھرکم اور ادھیڑ شخص ہماری طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا پھر جیسے اس سے صبر نہ ہو سکا اور ہمارے پاس آ کر بولا۔ "اگر آپ واقعی ماڈرن انڈیا کے ہیں تو میں آپ سے ایک ضروری بات کروں گا"

میرے اثبات میں سر ہلا دینے پر وہ ہاتھ بڑھا کر بولا

"میں ڈائریکٹر سوک ہوں گووند سوک چار پکچر بنا چکا ہوں۔ دو تو ہٹ ہو گئیں ہی پکچر ہندی میں بھی ڈب ہوئی 'کیسے کیسے لوگ'! کبھی نہ کبھی آپ کو بھی دیکھنے کو ضرور ملے گا۔ اچھا ۔۔ ایک بات اور ہے یہ جو نئی پکچر کی شوٹنگ کرنے کے واسطے ہم ادھر آیا ہے اس کی کتھا یہاں کے ایک پروفیسر آشیش داش گپتو نے لکھی ہے وہ بھی آنے والا ہے اس کے ساتھ آج کی سچویشن پر ڈسکشن ابھی ہونا ہے آپ دونوں کو دیکھ کر ایک بات ایک دم من میں آئی پروفیسر آشیش داش گپتو کو بتاؤں گا۔ ۔۔۔ ایسا ہے وہ بھی پسند کرے گا فلم بناتے بناتے بہوت اڈجسٹمنٹ کرنا پڑتا ہے دادا ابھی آپ یہاں پر ہیں نا اسی ہوٹل میں ۔۔۔ ہم لوگ پہلے ڈسکشن کر لیں پھر آپ کو بھی آ کے بتا دے گا۔ پر کیا آپ لوگ ایک آدھ سین میں کام کرنے کو راضی ہے نا؟ دیکھیے، ہمارے پاس بہت پیسہ نہیں ہوتا۔ بہوت سستے میں پکچر بناتا ہے ہم تو آرٹ پر مرتا ہے دادا اچھی کتھا پر ۔۔۔ اور اچھی ایکٹنگ پر اتارے بنگالی میں کسی کے پاس گر وہ یہ کمی نہیں ہے دادا، جو سارے انڈیا پر راج کرتا ہے اور کھوب کماتا ہے بس آرٹ پر مرتا ہے دادا۔"

میرا چودھری نے اس سے فوراً کہہ دیا۔

"ہم تیار ہیں، لیکن پہلے سے اسکرپٹ دکھا دیجیے گا ذرا ہم لوگ روم نمبر پانچ میں ہیں۔"

اپنے کمرے میں جا کر میرا نے کہا ۔۔۔ "میں نے تو کبھی ایکٹنگ ویکٹنگ کی نہیں۔ ابھی سے پسینہ آ رہا ہے"

"ایک آدھ سین میں ہوگا کیا؟ اس معاملے میں میں بھی تو ایک دم کوری ہوں لیکن مجھے ڈر نہیں لگ رہا ہے ایک آدھ چھچھوری تو ہوگا۔"

"اگر انھوں نے ہمیں کچھ سے کچھ بنا دیا، ماں بیٹا یا بھائی بہن!"

"تو کون سا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا، بنا دیں۔"

گیارہ بجے کے قریب گوروپد بھومک ایک معمر شخص کو ہمارے کمرے میں لے آیا ہم سے متعارف کراتے ہوئے بولا "یہ ہیں، ہمارے کتھا کار آستیش رائے داش گپتو۔ وشوا بھارتی میں انگلش لیکچر پڑھاتے ہیں انھوں نے میری تھیسس پر دو چار سین اور بڑھا دیے ہیں۔ آپ کو سنانے کے واسطے ساتھ لایا ہے۔"

پروفیسر آستیش رائے بولے

"ہماری کتھا میں جو ہیروئن ہے وہ دکلا مگ ہے پولیو کے کارن ایک دم چل پھر نہیں سکتی۔ ایک ہوٹل میں رشپشنسٹ — RECEPTIONIST کی جاب کرتی ہے اس کے پاس ایک ٹورسٹ عورت آتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر اُسے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتاتی رہتی ہے اور وہ جو ٹورسٹ عورت ہے ماڈرن انڈیا کی ایک فیمس رائٹر (WRITER) ہے اور ایک موڈرن نئے وچاروں کی اُس کی ملاقات لول پور کے بازار میں اپنی طرف کے ایک اور رائیٹر سے اچانک ہو چلتی ہے وہ بھی بہت فیمس ہے پر وہ پہلے سے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے پہلی بار یہاں بازار میں ملتے ہیں۔ ایک دکان پر کھلونے اور وال ہینگنگز (WALL HANGINGS) اور کچھ سٹیکر وغیرہ وہ سارا سامان جو ٹورسٹوں کے لیے جمع کر کے لایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے کے فرینڈس جاتے ہیں وہاں سے نکل کر ایک ریستوراں میں جا بیٹھتے ہیں جو کچھ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں وہ ہم آپ کو بتا دیں گے۔ اُمیں منگالی میں نہیں بولنا پڑے گا آپ اپنی بھاشا میں بولے گا پھر وہ رکشا میں ادھر اُدھر بہت دور تک گھومتے ہیں ہمارا کیمرہ آپ لوگوں کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ وہ آدمی اپنے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرنے کے واسطے الاٹ کرتا ہے عورت انکار نہیں کرتی ہمارا کیمرہ ان دونوں کو ایک روم میں اندر جاتے ہوئے پیچھے سے تاک لے گا اس کے بعد ایک اور سین ہے ہماری ہیروئن کے پاس بیٹھی ہوئی وہ عورت بولتی ہے۔ "مجھے اپنی آزادی پیاری ہے۔ اسی کے واسطے میں گھر بار، بچے، دنگا، شُش کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلی ہوں بس اسی کے بعد ہماری اپنی کتھا چلتی ہے۔ آپ لوگوں کا بس اتنا ہی کام ہوگا۔"

یہ سب سنتے ہی میں تو ہکا بکا رہ گیا میرا چودھری کے چہرے پر بھی ویسی ہی حیرت تھی یوں لگا، جیسے وہ ہم دونوں کو جانتے ہیں کئی روز سے ہمارے پیچھے پیچھے ہی گھوم رہے ہیں ہمیں اس قدر خاموش پا کر ڈائریکٹر بھومک بولا "دیکھیے دادا، انکار نہیں کیجیے گا آپ لوگوں کو دیکھ کر ہی اچانک اسا اچھا خیال

تو ہوگی اگر وہ ہماری کتھا کو ایک دم ہائی پچ (PITCH) پر لے جائے گا۔ اش سوالیس سے ہم اپنی سروش کاری ایکس (REACTION) دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی (DISABILITY) کی وجہ سے کچھ اندہیں کرپاتی۔ کاؤنٹر پر منشی بیٹھی آنے جانے والوں کے بارے میں اپنی ڈائری میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہے۔ شاری کتھا اس کی ڈائری پر آدھارت ہے ہم جانتے ہیں اس کے لیے آپ لوگوں کو چار پانچ دن اور رکنا ہوگا اس کا کرایہ اور دوسرے سارے بل ہم دیں گے آپ دونوں کو جہاں واپس جانا ہے وہاں تک کا فرسٹ کلاس کا کرایہ بھی دیں گے بس اتنا ہم کر سکتے ہیں"

مرا چودھری نے میری طرف ٹٹولتی ہوئی مگر گہری نظر سے دیکھا وہ میرے تذبذب کو سمجھ چکی تھی۔ دھیرے سے بولی" یہ لوگ ہمارے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں جانتے تھے لیکن اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دنیا کتنی چھوٹی ہو گئی ہے ہماری کہانیاں ہر علاقے کی کہانیاں بن گئی ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ کے مسائل ایک ہیں ہر جگہ ایک ہی گھر ہے۔ اسی گھر کے اندر کا ڈپریشن اور اس سے نکل بھاگنے کی تمنا بھی۔ اس سیلے ایک دوسرے کو اور زیادہ جاننے کا موقع مل رہا ہے تو ہاتھ سے کیوں جانے دیں۔" پھر اس نے سر گھما کر کلدیپ بھومک سے کہا "ٹھیک ہے دادا، ہمیں سب منظور ہے آپ کا کام کب تک شروع ہوگا؟"

جینے کی مہلت

سوندری مکھی جانتی تھی، وہ اب زیادہ نہیں جیے گی۔ بہت جلدی مر جائے گی۔ یوں تو جینے
کے لیے ستر برس بہت ہوتے ہیں پر اس کے اندر جینے کی اُمید کسی وجہ سے ختم ہوتی جا رہی تھی کہ اب
اس کے لیے مقصد ہی کون سا باقی رہ گیا تھا۔ راجو کے باپ کو مرے چالیس سال سے اوپر ہو گئے تھے
یہ راجو اس کے مر جانے کے بعد ہی جنا تھا وہ بیٹوں کے بعد آئی رو رو تو انھیں کو کھلا پلا کر اندر گھر
کی صفائی آدی کر کے جتائی اٹھائی گئی تھی کہ بیٹی بیٹا آ پڑی تھی ستوانے کی پیدائش بیتا ہی تو ہوتی
ہے۔ سوت کی تاب جیسا تھا وہ اور سب یہی کہتے تھے، بس دو ایک ہفتے سے زیادہ نہیں جیے گا
لیکن زندگی کی تاب لمبی ہوتی رہی اور وہ اسی کو دیکھ دیکھ کر اپنے رنڈاپے کا اپار غم بھولتی رہی تھی
بچوں کا پالن پوسن بہت مشکل ہوتا ہے ہر دم اُن کی موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے کیونکہ اُن کے
روگ سمجھنے والے کم ہی ہوتے ہیں حکیم ہوں یا ڈاکٹر لوگ — بچے اپنی تکلیف کہہ نہیں پاتے۔ ا
پیٹ میں درد اُٹھتا ہے تو گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگا لگا کر روتے ہی ہیں۔ پر جب پانی کی
طرح دست لگ جائیں یا سارا جسم سوکھنے لگے تو وہ لوگ اپنی اپنی اٹکل سے ہی کام چلایا کرتے
ہیں کچھ اٹکلیں یا ٹوٹکے وہ کئی پلے سے باندھے ہوتے تھی۔ بڑی بوڑھیوں سے سُن سُن کر۔ لیکن
سب سے بڑا بھروسا اُسے بھگوان کا تھا وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی۔ "بھگوان کے لاکھوں کروڑے ہتی

چاٹ چاٹ کر جی جاتے ہیں تو میرا رادھو بھی مٹی ہی چاٹ کر جی جائے گا پھر بھی سون مکھی نے رادھو کو اسی
طرح اپنا چاہا جب وہ اپنے پاؤں پر چل کر بھاگنے لگا اس کے بعد سے وہ آنکھیں بند کر کے کہہ
اٹھی "تو چاہے گا تو یہ سوورن سے بھی جیاستی جی جائے گا۔ میری ارتھی کو کاندھا دے گا اور خود ہی
آگ لگائے گا" اس کے اس وشواس نے رادھو کو ایک مضبوط کڑیل جوان بنا دیا تھا۔ جو ہر سال
ندی کے کنارے اپنی چھوٹی سی کھیتی پر بارش شروع ہونے سے پہلے ڈھیروں ترلوز لگا لیتا تھا اور
انہیں بیل گاڑی میں لاکر شہر کی منڈی میں بیچ آتا تھا اس کے بعد ہر سال باڑھ آجاتی تھی اور
سارے گاؤں والوں پر مصیبت کی آمد کھل جاتی تھی جتنے بھی گاؤں ندی کے کنارے کنارے
بسے ہوتے تھے باڑھ اتر جانے کے بعد رادھو دھان اگانے میں لگ جاتا تھا ـــــ دھان
بک جاتی تھی۔ کچھ پیسے کے قرض میں نکل جاتی تھی اور کچھ اپنے لیے بچ رہتی تھی دو چار مہینے کے لیے
پھر وہ دودھ بیچنے میں لگ جاتا تھا۔ وہ ایک جانور پالنے کا شوق سون مکھی کا اپنا تھا۔ جب تک
دودھ بیچنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ سارا دودھ بیٹے اور بہو کو اور اُن کے بچوں کو پلا دیتی تھی۔ جیسے
جیسے وہ پیدا ہوتے گئے یہ دراصل اسی کی محنت تھی جس نے رادھو اور بہو کو بھی اس کی عادت
ڈال دی تھی اپنے کام سے فارغ ہو کر اُن کا بھی ہاتھ بٹانے لگی تھی اپنے کاموں میں کھانا پینا
رکھ لینا اور چھوٹے چھوٹے پوتوں کو جو آگے پیچھے ہو گئے تھے۔ کڑوے تیل سے مالش کر کے سہلانا
دھلانا ہی ہوتا تھا اور وہ اُن کے بدن پر تیل ملتے ملتے کہا کرتی تھی۔ دیہاتیوں کے ہڈیاں بھگوان
خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے تاکہ زندگی بھر کام کرے اور زبردست مار کھانے سے بھی نہ ٹوٹیں، نہ ہی
تھکیں دیہات میں جنم لینا ہی شہر کے حاکموں سے زندگی بھر ذلیل و خوار ہونا ہے ــــ یہ بھی بھگوان
کی مرضی ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی سون مکھی کا گہرا عقیدہ تھا۔ کیونکہ وہ کبھی نہیں بھول پائی تھی کہ اس
گاؤں میں بیاہ کر لائے جانے کے چوتھے ہی روز وہ فصل کٹائی میں اپنے آدمی کا ہاتھ بٹانے کے لیے
کھیت پہنچ گئی تھی لیکن وہاں جاتے ہی تحصیل دار کا بیٹا اسے جیپ میں زبردستی ڈال کر لے گیا تھا
پھر اس کے آدمی اُسے گاؤں کی چوپال پر رات کے اندھیرے میں اَدھ مرا سا چھوڑ گئے تھے۔ وہ گرتی پڑتی
اپنے گھر کی چوکھٹ پر جا کر اوندھے منہ گر پڑی تھی تاکہ دہلیز پر جا کر جان دے سکے اس کا آدمی رات بھر
اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ لوٹ کر اسے سسکتے اور مٹی چاٹتے ہوئے دیکھا تو اُس کے

پاس وہ کتنی ہی دیر بیٹھا سا رہ گیا تھا بڑی مشکل سے صرف اتنی ہی کہہ پایا تھا۔ "اے تیرا سارا زہر
پی لیا ہے سون مکھی۔ جس طرح ستیو جی نے پیا تھا میں تجھے کبھی کچھ نہیں کہوں گا روز رو کر جی ہلکا مت
کر۔ تو مرنے سے پہلے دن کی طرح پوتر ہے"

وہ جانتی تھی اس زہر کو پینے کے پیچھے اس کی کون سی مجبوری تھی۔ اُسے دو کام کرنے والوں ہاتھوں
کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والے ہاتھوں کو کھو دینا دیہاتی کی موت ہوتی ہے۔ سون مکھی ہمیشہ سر جھکاتے
ان ہاتھوں سے مشین کا سا کام کرتی رہی۔ لیکن پھر کبھی نہ مسکرا سکی پھر جب وہ مادھو کے لیے چار کوس
دور کے ایک گاؤں سے بہو بیاہ کر لائی تھی تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا اسے
ایک ملاک افسر نے اس کو پہلی ہی رات اٹھوا لیا تھا اور اُسے بھی رات کے پچھلے پہر کھیت کی مینڈھ پر
بے ہوشی کے عالم میں ڈال دیا گیا تھا اُسے بھی مادھو نے باپ کی طرح دلاسے کا امرت ملا کر زہر پینے
میں کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ اُسے بھی کام کرنے والے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی وہ بھی اپنی عزت دھونے
سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے باوجود اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی رہی تھی اور بچے پیدا کر رہی تھی اور اس ہی
میں کمزوری بھی رہی تھی اس کی مسلسل کمزوری تپ دق بن کر ابھر آئی تھی اب وہ کئی سال سے کھانسی
بیٹی سے لگی جوں تھوکتی رہتی تھی ۔۔۔ اور کھانستی رہتی تھی مادھو بھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا اور
اس کے تین بیٹے بھی جوان ہو کر کمانے کھاتے چل بسے تھے۔ اب صرف ایک لڑکا بچ رہا تھا۔ پلٹو۔۔
جو پہلے تو گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ دن بھر شرارتیں کرنے اور لوگوں سے مارپیٹ کرنے میں لگا رہتا
تھا۔ لیکن جب اس کے ساتھی ایک ایک کر کے شہر میں جا کر نوکری کرنے لگے تھے تو اس کا من کھیتی
باڑی اور وہ سارے کام کرنے میں رمنے لگا تھا جو اس کا باپ مادھو کیا کرتا تھا

سون مکھی اس حد تک تو مطمئن تھی کہ پلٹو چونکہ محنت مزدوری کرنے کا عادی ہے وہ بھوکا کبھی نہیں
رہے گا لیکن جب وہ مر جائے گی تو وہ کس قدر اکیلا رہ جائے گا ابھی تک اس نے پلٹو کا بیاہ نہیں
کیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی بہو کے ساتھ بھی وہی حشر نہ ہو جو اس کی ماں اور دادی کا ہوا تھا۔
پلٹو کے کانوں میں اپنے باپ داداں کی بے عزتی کی بھنک پڑ چکی تھی۔ ایسی باتیں چھپائے چھپی تھوڑے ہی
رہتی ہیں کسی نہ کسی کے ذریعہ سے معلوم ہو ہی جاتی ہیں۔ وہ شہر والوں سے سخت نفرت کرتا تھا اس کے
دوست بھی ویسی ہی نفرت کا اظہار کرتے تھے جو شہر میں جا کر بس کنڈکٹری یا ڈانڈی وغیرہ کرنے

گئے تھے چھٹی تہوار کے دن گاؤں میں آجاتے تو وہ سب مل کر پلٹو کو ایسی ایسی باتیں سناتے کہ پلٹو
کے چہرے پر خوشی کی رونق آجاتی جیسے وہ صرف اسی بات سے مطمئن ہو جاتا ہو کہ اس کے دوست
شہر والوں کی لڑکیوں کے ساتھ اپنی بسوں میں کچھ بدسلوکی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا اسکول
سے لوٹتے وقت جب وہ اپنے چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی ہوئی گاڑی میں کسی ایسے ڈبے کے سامنے
جمع ہو جاتے تھے جس میں لڑکیاں دکھائی دے جاتی تھیں اور وہ انھیں نہ صرف ٹکٹکی لگا کر
گھورتے تھے بلکہ بھدے بھدے اشارے بھی کیا کرتے تھے پلٹو نے خود ایسی کبھی کوئی شرارت
نہیں کی تھی لیکن وہ اُن کی باتیں سنتا ضرور تھا اور بہت ہی خوش دکھائی دینے لگتا تھا

پلٹو کے سارے دوست جو شہر میں تھے، پتلونیں اور بشرٹیں پہننے لگے تھے لیکن وہ ابھی تک
لنگی باندھنے کا عادی تھا کرتا چھوڑ کر کبھی کبھی بشرٹ ضرور پہن لیتا تھا، جو اس نے کسی دوست
کے ہی کہنے پر خریدلی تھی اور وہ بھی تب پہنتا تھا جب وہ اپنی گھوڑا گاڑی میں ترکاری لاد کر شہر جاتا
تھا ہاں ایک شوق اُس نے خود سے پال لیا تھا بلا کسی کے کہے ایک ٹرانسسٹر وہ ہر وقت
کندھے سے لٹکائے رہتا تھا چاہے وہ کھیت میں ہوتا یا شہر جاتے ہوئے گھوڑا ہانک رہا ہوتا۔
وہ بڑے مزے سے گانے بھی سنتا اور دوسری باتیں بھی جو وہ سوئی گھما گھما کر کہیں نہ کہیں سے
تلاش کر لیا کرتا تھا اور پھر رات کو جب وہ دواسکوں سے ہوتا تو اپنی بیمار ماں اور دادی سونکی
کو بھی سناتا تھا باہر کی دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ کہاں کہاں کون سے کارخانے لگ رہے
ہیں، کھاد اور بیجوں کے بارے میں سرکار کیا کہتی ہے، نیتا لوگ آپس میں کیوں جھگڑتے
ہیں اور کیسے کیسے ڈرامے سے بولتے ہیں۔

سونکی بھی اپنے نو عمر بیٹے کے منہ سے بعض اوقات بڑی سمجھداری کی باتیں سن کر حیرت میں
پڑ جاتی تھی۔ سوچتی تھی اگر اُسے بھی بے اسکول میں ڈال دیا ہوتا تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح
کچھ پڑھ لکھ جاتا اور شاید وہ بھی شہر جا کر نوکری کرنے لگ جاتا اور شاید اپنی ماں کو کسی اسپتال
میں بھرتی کرا کے اس کا علاج بھی کراتا ایک بار وہ ماں دیبی کو اپنی گھوڑا گاڑی میں لاد کے گیا
تھا لیکن پھر یہ کہہ کر واپس لے آیا تھا کہ وہاں تو غریبوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے جب تک
ڈاکٹروں کو فیس نہ دی جائے وہاں تو گاؤں کے لوگ برآمدوں میں زمین پر ڈال کر

کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ماں کو مرنا ہے تو اس سے اچھا ہے کہ اپنے گھر پر تو مرے۔ جو کچھ دوا دارو میں کر سکتا ہوں کر ہی رہا ہوں گا۔

سون نکھی جانتی تھی۔ اس نے ایک بار کسی ڈاکٹر سے اپنی ماں کے علاج کے لیے جو نسخہ لکھوایا تھا اسی کے مطابق خود شہر سے دوا خرید کر لے آتا تھا یا کسی کے ذریعہ منگوا لیا کرتا تھا اور اس روز بھی جب وہ گاڑی میں تربوز بھر کر شہر کی منڈی میں بیچنے کے لیے جا رہا تھا اس کا ارادہ رام دین کے لیے مہینہ بھر کے لیے اکٹھی دوائیں خرید لانا تھا۔ سون نکھی بھی تربوز بکوانے کے لیے اس کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ اس کے ساتھ تھی۔ تربوزوں سے بھری ہوئی گاڑی پر بیٹھی سندر سندر آنکھوں سے سڑک پر آنے جانے والی سربلند بسوں اور ٹرکوں کو بڑی خاموشی سے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے آج تک کبھی بس یا گاڑی سے سفر نہیں کیا تھا۔ اس کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ پلٹو جو اپنے کاندھے سے ٹرانسسٹر لٹکائے بڑے مزے سے فلمی گانے سن رہا تھا اور گھوڑا بھی ہانک رہا تھا ' دادی کا شاید جی بہلانے کے لئے ہی اُسے بتانے لگا — " اماں یہ بس جوا بھی گئی ہے نا پھنتپور تک جاتی ہے اور وہ لمبی پیلے رنگ والی بس جو آ رہی ہے اسکوٹر بنانے والی کمپنی کی ہے۔ کمپنی کے اندر جو کاریگر کام کرتے ہیں انہی کو لے آتی ہے ' لے جاتی ہے "

پھر جب وہ ہوائی اڈے کے سامنے سے گزرے تو پلٹو نے اُسے بتایا — " اماں ادھر دیکھو! ایک جہاز ابھی ابھی اُترا ہے۔ وہ شاید کلکتے یا دلی سے آیا ہے۔ اُن میں بہت سے مسافر اُتریں گے اور اُن کو بھی کمپنی کی بس بھر کر لے جائے گی۔ سب بڑے بڑے لوگ اترتے ہیں جہاز سے۔ سالوگ اور کارخانوں کے مالک اور پیسے والے ۔"

سون نکھی کوئی جواب دینے کے بجائے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ یہ سب پیسے کا ہی کھیل ہے۔

سبزی منڈی کے باہر سڑک کے کنارے پلٹو نے سارے تربوز اتار کر ڈھیر کر دیئے۔ اور زور زور سے چلانے لگا — " دو دو روپے ! تین تین روپے ! آ دا آ دا ! بہت سستے مال لگا دیا۔ دو دو روپے ' تین تین روپے !

دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ لگ گئی۔ پلٹو تربوز اُٹھا اُٹھا کر گاہکوں کو دکھاتا اور انہیں طرح طرح سے رجھاتا

اور پھر پیسے وصول کر کے اماں کے حوالے کر دیتا۔ "رکھو اماں۔ بابو صاحب کو دو روپے واپس دے دو۔
-آئیے صاحب لال لال تربوز۔ کھائیے! میٹھے شہد کے مانند تربوز لیجئے!"
وہ چاٹ چاٹ کر اچھے اور بڑے تربوز آگے بڑھاتا رہا۔ جیسے چلانے سے ذرا سی فرصت پاتا تو سکون
کی سے کہا۔ "اماں! آج منڈی میں سب سے پہلے پہونچے ہیں یہ سب تھوڑی دیر میں بک
گی اماں آج میں ماہتاری کے لیے مہینہ بھر کی دوا لے جاؤں گا۔"
تھوڑی ہی دیر بعد اچانک وہاں دو ٹرک آ کر کھڑے ہو گئے۔ جس سے سارا راستہ رک گیا۔
ٹھیلے والوں اور اسٹال والوں نے پہلے ہی سڑک کا بڑا حصہ گھیر رکھا تھا جس کی وجہ سے سارا ٹریفک جیسے
رینگ رینگ کر گزرتا تھا۔ ٹرکوں کو اپنے مال کے سامنے رکتا ہوا دیکھ کر بلٹو کو غصہ آ گیا۔ لیکن اس سے
پہلے وہ کچھ کہتا۔ دونوں ٹرکوں میں سے بہت سے باوردی پولس والے اور میونسپل کارپوریشن کے
کارندے کود کود کر اتر آئے اور سڑک کے کنارے کنارے عارضی طور پر بنائے ہوئے لکڑی کے اسٹال
اکھاڑ اکھاڑ کر ٹرک کے اندر پھینکنے لگے۔ سبزیاں اور پھل بھی اس افراتفری میں نے تمام تربوز اور ٹماٹر
اور آم سڑک پر دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ پیروں کے نیچے آ کر ٹوٹ گئے اور کچلے جانے لگے۔ سرکاری کارندوں
کا یہ اچانک حملہ پھل اور سبزی فروشوں کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ کبھی کبھی اچانک یہ پہلے بھی ہو چکا تھا
لیکن اس کا اثر منڈی کے اندر کے دکانداروں پر نہیں پڑتا تھا۔ باہر فٹ پاتھ کے دکاندار ایسا کاروبار
اور مال اس طرح بے رحمی سے اُجڑتا دیکھ کر برہم ہو اُٹھے۔ جو لوگ پولس اور کارندوں کے ساتھ گتھم گتھا
ہو گئے انہیں دیکھ کر بھاگتے ہوئے لوگ بھی لوٹ آئے لیکن پولیس والوں نے سب کی خوب کس کر پٹائی
کر دی اور تیس چالیس آدمیوں کو ٹرک میں بھر کر لے گئی۔ ان کا سامان بھی اُٹھا لے گئی۔ سون مکھی اس
اُٹھا پٹک کے طوفان سے اس قدر گھبرا گئی تھی کہ وہ لوری کے نیچے رکھی ہوئی ساری نقدی بھی گنوا بیٹھی اُسے
پتہ ہی نہ چلا وہ لوری کیسے لوگوں کے پاؤں کے ساتھ گھسٹتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح بھاگ کر
خالی بکسوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے جان بچا پائی تھی۔ انہی بکسوں کی آڑ میں اس نے بلٹو کو پولس کے ساتھ
لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ صرف ایک بار۔۔۔ پھر وہ بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا
جب وہ شام کو تھکی ہاری گھونڈا اٹھتی ہوئی حال بیٹھے من بیٹھی گاؤں کی اور لوٹ رہی تھی تو
وہی اسکول پکنک کی نیلی پیلی بس اپنے کار بچوں کو کھانے سے واپس لئے جا رہی تھی،

اور ہوائی اڈے کے اوپر ایک جہاز اُڑتا پھرتا تھا اور ایک جگہ سڑک کے کنارے رُکی ہوئی بس کے مسافروں اور دیہاتی لڑکوں میں کسی بات پر تُو تُو میں میں ہو رہی تھی۔ سوزن بھی پہلے کی طرح ہر چیز سے لاتعلق سی آگے بڑھ گئی سر جھکائے اور ایک ہی بات سوچتی ہوئی ـــــ اگر کچھ دن اور ٹنگواں جیسے کی مہلت دیدے تو پلٹو کو کسی کی ضمانت پر جیل سے واپس لے آئے یا جب تک وہ جیل میں رہے وہ رام دئی کے دوا دارو کے لیے محنت مزدوری کرتی رہے ـــ!

ایک ٹرک بازار میں

ڈلہو سنگھ نے دوسرے کھیت سے آلوؤں سے بھرا ہوا ایک ٹرک نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا ورنہ اُس کا ارادہ تھا کہ سڑک کی گھنی چھاؤں اور ہلکی ہلکی ہوا اور سُرور رفتہ اس کی نیند کو اس کے قریب، بہت قریب کیے دے رہی تھی کی گود میں پہنچ جاتے۔ تھوڑی دیر پہلے ساون رام کی بیٹی گلابی اُسے گڑ کے ساتھ تین بڑے بڑے گیہوں کے پراٹھے کھلا گئی تھی اُن کی وجہ سے بھی اُس کی آنکھوں پر غنودگی چھا رہی تھی۔ جس سے بچنے کے لیے اُس نے اپنے ٹرک کے تین چار چکر لگائے کلینر کو اُس کی فوراً صفائی کی ہدایت کی۔ پھر آلوؤں کے اس ڈھیر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جہاں دس کھیت مزدور انھیں بوریوں میں بھرنے میں مصروف تھے۔ ایک مزدور سُتلی اور سوجے سے بوریوں کا منہ بند کرنے میں لگا ہوا تھا ایک اور مزدور لال رنگ کا ڈبہ اُٹھائے ایک چھلے ہوئے داتون سے بوریوں پر ساون رام کا نام لکھتا جا رہا تھا۔ ساون رام خود ایک اور پیڑ کے نیچے بیٹھا چلم بھی گڑگڑا رہا تھا اور اپنے سامنے زمین پر آلوؤں کو اس ترتیب سے رکھے ہوتے تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ صبح سے کتنے سو بوریاں کولڈ اسٹوریج میں بھجوائی جا چکی ہیں۔

ڈلہو سنگھ نے اپنی نیند کو اُڑانے کے لیے قہقہے لگا کر کہا۔ "ساون رام جی، تمہارے مُنّی پوستہ کھا کر آتے ہیں کیا؟"

"کیا ہوا؟" ساون رام نے بڑے اطمینان سے چلم گڑگڑاتے ہوئے جواب میں پوچھا
اس نے ایک جھٹکے سے چارپائی چھوڑ دی اور کھلتے ہوئے تہمد کو کس کر کر کے گرد لپیٹا اور پھر کھلے
سر کے بال جوڑے میں سمیٹتا ہوا مزدوروں کی طرف چل پڑا یہ کہتا ہوا
"میں نے قاسم کے ساتھ شرط لگا رکھی ہے کہ اس سے پہلے تمہارے کھیت کا مال کولڈ اسٹور تک
میں پہنچاؤں گا پر میرا دوسرا ٹرک نکلنے سے پہلے اس کا دوسرا چکر لگ رہا ہے دیکھو قاسم کھڑکی میں سے
بانہہ نکال کر مجھے چڑا رہا ہے'
جو ٹرک دوسرے کھیت میں سے آلوؤں کے بورے لاد کر سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا ڈرائیور
بیچ بیچ ہنستا ہوا بھی دکھائی دیا
دولہا سنگھ ملٹری کا ریٹائرڈ ڈرائیور تھا چوٹ لگ جانے سے لنگڑا ہو گیا تھا ڈیل ڈول
کا مضبوط اور لمبا تھا اس نے مزدوروں کے پاس جاتے ہی ایک کو ہلکی سی دھول جمائی کسی کسی کو پیار
سے گالی بھی دی اور ساتھ ساتھ شاباشی بھی پھر بوریوں کا منہ سینے والے مزدوروں کے ہاتھ سے سُتلی اور
سُوا لے کر جلدی جلدی دس بارہ بوریوں کے منہ بند کر دیئے۔ لمحوں ہی لمحوں میں سو کے قریب بوریاں
کو گیا جو لادے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں پھر ساون رام کی طرف بڑھتے ہوئے بولا — "ان
پوستیوں سے کہو میں ایسی شرط نہیں ہارا کرتا"
"کون سی شرط بدی ہے میں نے سردار؟"
ساون رام کے انداز سے لگتا تھا، اُسے بھی دولہا سنگھ کے شرط ہار جانے پر چنداں افسوس
نہ ہوگا۔
دولہا سنگھ اس کے سامنے پیروں کے بل بیٹھ گیا اور دور میں پڑے آلوؤں کی گیلی گیلی قطاریں بڑے
غور سے دیکھتے ہوئے بولا — "شرط ہار جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہوگا کہ اس میں سے مجھے حصہ
نہیں ملے گا قاسم میرا بڑا یار ہے کچھ سال پہلے ہم ایک ہی ٹرک مالک کے ملازم تھے۔ اب ہم
دونوں اپنے اپنے ٹرک کے مالک ہیں اور اکثر ساتھ ساتھ مال ڈھونڈتے ہیں کئی بار ہمارا ساتھ
مدارس اور بمبئی تک مال لے جانے کے سلسلے میں رہا ہے ہم تو بس دلچسپی کے لیے شرط لگا لیتے
ہیں جو پہلے اپنا کام ختم کر لے وہ بوتل لینے کا حقدار بن جائے شام کو دارو شغل منانے کا بہانہ

چاہیے اور کیا؟"

ساون رام کالے تریپر کا ایک کھرا ادھیڑ عمر کسان تھا اُس نے ڈُلہ سنگھ کی بات جیسے اَن سُنی کرکے کہا — "تمہارے پنجاب کا چودھری برکت رام کا آدمی پھیرے پھیرے آیا تھا آلوؤں کی فصل دیکھ گیا بھاؤ بھی بتا گیا کہتا تھا ہم دو ایک ہفتے کے بعد کولڈ اسٹوریج سے سارا مال اٹھا لیں گے میں نے کہا ابھی اُٹھا لو۔ یہیں سے سیدھے منڈی میں لے جاؤ۔ بولا۔ منڈی میں بہت مال آگیا ہے اور سب سستا بِک رہا ہے ابھی پندرہ بیس روز کے بعد اچھا بھاؤ ہاتھ آئے گا"

"پھر وہ کچھ بیانہ ویانہ بھی دے گیا کہ نہیں؟"

"وہ تو دے رہا تھا میں نے منع کر دیا۔ جب اُٹھانے آؤ گے تبھی طے کرلیں گے۔ ساپھ کہیا۔"

"بڑے ہوشیار ہو ساون رام! اب تم بھی پھصلوں کے بیوپار کی ساری اے بی سی سیکھ گئے ہو۔"

"سب پیٹ سکھا دیتا ہے سردار اور حکومت بھی سرکار کا بھلا ہو بڑی سہولتیں دیدیں۔ بیج کے لیے کرجا، کٹائی چھٹائی کے لیے قرجا، اُس کے اوپر پھسل کا بیمہ اور جمیں سے بید کھلی کے کھلاپھ قانونی مدد بھی۔ بس ایک کام اور بھی سرکار کر دیتی تو کسان بڑا سکھی ہو جاتا۔ بہت جیادہ سکھی"

ڈُلہ سنگھ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا جتنی سرکاری سہولتوں کا اس نے ذکر کیا تھا۔ اُن سب کا اس کے باپ دادا کے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اُن سے اُس نے اُن کے زمانے کے مصائب کی ساری کہانیاں سُنی تھیں اسی لیے تو اس نے کھیتی باڑی کا کام چھوڑ کر ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس کے بزرگوں میں اب کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔

"بات یہ ہے سردار ہماری پچھڑی جاتوں کو اُوپر اٹھانے کے واسطے سرکار جتنی سہائتا کر رہی ہے ہم اس کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدل رہے ہیں تم جانتے ہو ادھر کا امر گیت میرے ایک بُڈھے کسان کا بیٹا ہے اُسے میں نے بچپن ہی سے اپنے ساتھ رکھ کر محنت مزدوری کرا سکھایا اسے پٹے پر زمین بھی لے دی۔ جس جس طرح مجھے کرجے ملے ہیں۔ اس کو بھی دلاتے ہیں۔ اس کا سالا شہر میں نوکر ہے، ایک دفتر میں بابو ہے۔ شاید اس نے کہا۔" اس کا رشتہ میری بیٹی سے کرا دو۔ لوگ اُنہیں

ہے۔ اک یکسے کا بھی ٹھیک ہی ہے پر اُونچی جات برادری والوں کی دیکھا دیکھی اس کو بھی ہوا لگ گئی۔ کہتا تھا دس ہزار تو نقد لوں گا۔ ابھی کی بات میں بیٹھے ہوئے بتاؤں گا میں کہتا ہوں ہماری جات برادری میں پہلے ایسی بات کبھی نہیں ہوتی تھی۔ سرکار جتنے قانون بنا رہی ہے ہم لوگوں کی بھلائی کے واسطے ایک یہ بھی بنا دیں کہ جو کوئی بنا دہیج کے شادی کرے گا اُسے ترقی مل جائے گی اس سے بہت سے ماں باپ کے سنکٹ کٹ جائے"

دلیپ سنگھ نے سر گھما کر پہلے تو ذرا فاصلے پر سے ہوتے چند گھروں کی طرف تاکا جن میں سے ایک گھر ساون رام کا بھی تھا پھر اُس نے کام کرتے ہوئے مزدوروں کی طرف نظریں گھمائیں اور اسی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"سماج کے سب رواج بدلنے والے تو ہم خود ہوتے ہیں تم ہی بتاؤ اگر تم ووٹوں سے جیت کر اسمبلی میں پہنچ جاؤ اور اتفاق سے منتری بھی بن جاؤ تو کیا ایسا قانون بناؤ گے؟"

"ارے میں تو بالکل اَن پڑھ آدمی ہوں سردار! ووٹ لوں گا اور منتری بھی بنوں گا؟ مذاق والی بات مت کرو جی۔ ہماری ہی برادری کا وکیل ایک رام مصری بیٹھا ہے۔ بڑا نیک بھلا ہے وہ یہ بات کیوں نہیں سوچتا؟"

"تب تم اپنی بات کیوں نہیں کہتے اس سے؟ کیا کوئی تمہیں اس کے پاس جانے سے روکتا ہے؟ اپنی جات برادری کی بات اس سے ضرور کہنی چاہیئے ___ وہ سب کو جمع کر کے بھی سمجھا سکتا ہے سارے مسئلے قانون سے تھوڑے ہی حل کرائے جا سکتے ہیں"

ساون رام نے اپنے مزدوروں کی طرف سر گھما کر زور سے پکارا ___ "اے سگنا! راما ہو—ا جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ دھرا کاتا مُردوں کی طرح کام کرت ہو؟"

پھر اُس نے اپنے گاؤں کی طرف تاکا اور بولا "گلیا کا کر رہی ہے پتہ نہیں اُن کے لیے چائے کی بالٹی لے کے آنے کے واسطے کہا تھا یہ سسرے جب تک چائے نہ ٹریک لیں گے ہاتھ پاؤں چلانے میں پھرتی نہ دکھا دیں گے؟"

پھر وہ مزدوروں کی طرف دیکھ کر چلّایا "اے سوموا! تو ٹک آجاؤ۔ بیڑی کے بنڈل لے جاؤ رے!"

اس نے ایک بوری کے نیچے رکھے ہوئے بیڑیوں کے چار پانچ بنڈل اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیے اور انھیں گرگرانے لگا

ڈلو سنگھ اُٹھ کر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے بولا ـــ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔ چائے تیار ہو گئی ہو گی تو لانٹی اٹھا کر لے آؤں گا تم ذرا مزدوروں کے سر پہ جا کر کھڑے ہو جاؤ بابا!"

ساون رام کی بیٹی اُسے دروازے پر ہی مل گئی وہ ایک ہاتھ میں گرم گرم چائے سے بھری ہوئی لانٹی کپڑے سے پکڑے ہوئے تھی اس کے دوسرے ہاتھ میں دس پندرہ لال لال مٹی کے کلہڑ تھے

ڈلو سنگھ نے اس کے ہاتھ سے لانٹی لے لی اور اس کی طرف ستوری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "گلابی! تیرا باپو تو ابھی تک اُسی آدمی کے خواب دیکھ رہا ہے تو نے اُسے بتایا نہیں میرے ٹرنک کے اندر رکھے ہوئے گہنوں کے بارے میں جو میں نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد وہاں رکھ چھوڑے ہیں!"

گلابی سر جھکا کر بولی "یہ سب تو اُسے پہلے سے معلوم ہے!"

"پھر ـــ؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا ـــ "پھر کیا کہتا ہے وہ؟"

"میں کیا جانوں!" وہ شرم سے لال سرخ ہوتی گئی "تم خود ہی کیوں نہیں کہہ دیتے باپو سے، صاف صاف پوچھو!"

"کیا معلوم، بڈھا انکار ہی نہ کر دے کہیں؟"

ساون رام مزدوروں کے پاس کھڑا مڑ مڑ کر ڈلو کو آتا ہوا ہی دیکھ رہا تھا ڈلو نے اُن کے پاس پہنچ کر لانٹی زمین پر رکھ دی وہ خود ہی پاؤں کے بل بیٹھ کر چائے کے کلہڑ بھر بھر کر گلابی کو دینے لگا۔ مزدور اُن کے سامنے قطار باندھ کر زمین پر بیٹھ گئے تھے گلابی ہر ایک کے ہاتھ میں چائے کے کلہڑ دیتی گئی

ڈلو نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا ـــ "چار بج رہے ہیں یار پانچ کے تک ٹرک بھر دو تو میں ایک چکر لگا لوں گا"

اسی وقت پاس کے کھیت سے ایک ٹریکٹر بھی گڑگڑاتا ہوا آ گیا جس کے ٹریلر پر بہت سی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ٹریلر کے پیچھے پیچھے جو مزدور بھی آ گئے تھے وہ سب مل کر ٹرک میں لدیا

لادے لگے ساون رام ہر ایک لوری پر پیلی سیاہی سے لکھے ہوئے نشان دیکھا گیا پھر اس نے اپنی مزدوروں کو اپنی لوبیاں بھی لادے پر لگا دیا۔ ڈولیہ سنگھ اب کچھ مطمئن سا نظر آیا پیڑ کے پیچھے چارپائی پر رکھی ہوئی اپنی پگڑی بھی اٹھالایا اور سر پر جما کر باندھتے ہوئے ساون رام سے بولا۔ "شام تک ایک ٹرک مال اور بھروا دو تو سمجھو بیڑا پار ہو گیا"

"سردار بھروا دوں گا نہیں تو کیا یہ رات بھر کھلے آسمان کے نیچے پڑا رہے گا۔ بارش واپس ہوگئی تو سب ستیاناس نہیں ہو جائے گا!"

ٹرک روانہ ہونے لگا تو ایکا یک ساون رام اس کے پاس آکر بولا "سردار گلابی بھی تیرے ساتھ جا رہی ہے ہمارے کچھ سامان لینا ہے اُسے جاتے وقت اتار دینا آتے وقت ملک لیتے آنا"

پھر اُس نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ جدھر سے گلابی لعل میں ایک پوٹلی دبائے جلدی جلدی بھاگتی ہوئی سی چلی آرہی تھی وہ ایک بار لڑکھڑائی تو اس کا باپ چلّا کر بولا ــــ "ذرا سنبھل کے چل ری چھوکری۔ گر پڑی اور چوٹ ووٹ کھا گئی تو میرا تو گھر بھی سنبھالنے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ ٹرک میں ڈولیہ سنگھ کے ساتھ آگے بیٹھ گئی۔ راستے بھر پیچھے آلوؤں کے بورے پر بیٹھے ہوئے مزدور گانا گاتے رہے اُن کی یہ خوشی محنت مزدوری کے وقار کا ہی ایک اظہار تھی ڈولیہ سنگھ نے کہا

"تم باپ بیٹی دونوں بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔"

"کیسے؟" گلابی نے بڑی حسرت سے اُس کی طرف تاکا۔

"تھوڑی دیر تک پہلے تو تیرا میرے ساتھ آنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا یہ اچانک کیسے فیصلہ ہو گیا؟"

"وہ تو میں نے کہلایا باپو سے سردار تمہارے سہارے ہی تو ہو کر جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں۔ اسی کے ساتھ لوٹ آؤں گی مان گیا باپو۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں تم دونوں بہت چالاک ہو۔" وہ خوش ہو کر بولا وہ چہک کر بولی۔

"اس میں چالاکی کی کونسی بات ہے؟"

"اب یہ کوئی شرارت تو ہے نہیں جو تیری سمجھ میں نہ آ رہی ہو" وہ اسٹرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے کتنے لمحوں تک اُس کی طرف گھورتا رہ گیا۔ پھر اس کے پاس سے کتنے ٹرک اور بسیں نکل گئیں اور وہ اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ پیچھے سے آنے والی ایک کار کو بھی راستہ دے چکا اور پھر اپنے سامنے دُور تک سڑک کو صاف پا کر بولا ــــ "کیا تیرا بالو اس طرح مجھے کسی اور ڈرائیور کے ساتھ بھیج سکتا تھا؟"

"وہ تمہیں جانتا ہے نا کتنے مہینوں سے یہاں کا مال ڈھو رہے ہو۔" "اس کا مال تو اور کئی ڈرائیوروں نے بھی ڈھویا ہوگا پر اس کی جوان بیٹی کو اب تک کسی نے اس طرح نہیں ڈھویا ہوگا مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے۔" وہ ہنس بھی پڑا

"کیا کالا کالا نظر آ رہا ہے"؟ وہ اسی طرح معصومیت سے بولی اگرچہ اس کے چہرے پر خوشی کی رنگت بھی ہویدا تھی۔

دُرلبھ نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر تک سر گھما گھما کر اُسے دیکھتا رہا۔ سانولی سلونی سی لڑکی کو حسن کے چہرے اور لباس کی کیفیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ گاؤں اور شہر کے فاصلے سے کافی اوپر اُٹھ چکی ہے۔

محور کے بیچوں بیچ جس بازار سے ٹرک کو گزرنا تھا وہاں ایک جگہ درلبھ سنگھ نے گلابی کو اُتار دیا۔ وہ کھڑکی کے پاس اس کے ساتھ اپنی واپسی کا پروگرام طے کر رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک سائیکل سوار آ گیا اور گلابی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟"۔

اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے پہلے سے جانتا ہے اور اُسے ایک سکھ ڈرائیور کے ساتھ کھڑے ہو کر اس طرح باتیں کرتا ہوا دیکھ کر اچھا نہیں لگا ہے لیکن گلابی نے اُسے کوئی جواب نہ دیا ــــ اور دُرلبھ سنگھ سے بولی،

"یہ وہی لڑکا ہے جس کے ساتھ بالو نے بات چلائی تھی۔"

دُرلبھ سنگھ نے اُسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور گلابی کی طرف بھی جو اُسے کوئی جواب دیے بغیر جانے لگی تھی۔ اس لڑکے نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہوئے کچھ باتیں اور کہیں اور سر گھما گھما کر دُرلبھ سنگھ کی طرف بھی دیکھا۔ گلابی کھڑی ہو گئی اور اُس نے تیز تیز لہجے میں کچھ کہا ــــ دُرلبھ سنگھ سمجھ گیا وہ اس پر اپنا کچھ حق سمجھ کر اس سے جواب طلب کر رہا ہے۔ اس سے رہا

گیا اور ٹرک چھوڑ کر اُن کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ گلابی کے منہ سے صرف یہ جملہ نکل سکا۔ "تم سے مطلب،
میں کسی کے بھی ساتھ آؤں جاؤں!" اُس نے لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا کہتا ہے موا؟"
لڑکے نے کچھ تیز ہو کر گلابی سے کہا۔ "میں تیرے باپو سے شکایت کروں گا۔"
"کیا شکایت کرے گا؟ مجھے بھی تو بتا؟" دُرلبھ دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا
"میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔" وہ اُسی غصے سے بولا۔
"کیوں نہیں کر رہا ہے۔ تجھے مجھ سے بات کرنی پڑے گی اور میں یہ بھی پوچھتا ہوں تو نے اس سے
بات ہی کیوں کی؟ بول؟" یہ کہہ کر دُرلبھ نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ لیا۔
وہ کالر چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری پولیس میں رپورٹ کر دوں گا۔ میرا کالر چھوڑ دے۔"
"پولیس کیا تیری ہی سب کچھ لگتی ہے؟ میری کچھ نہیں؟ چل کون سے تھانے میں لے چلنا ہے
مجھے۔ میں بھی یہاں سب کو جانتا ہوں۔ مجسٹریٹ تک مجھے پہچانتے ہیں۔ اُن کی عدالتوں میں
میں نے کئی بار جرمانہ بھرا ہے اور اُن سے پرمٹ بھی لیے ہیں۔ یہ مت بھول کہ انصاف کے
دروازے سب پر کھلے ہیں، صرف تیرے جیسے شہری بابوؤں کے لیے نہیں جو رشتہ کرنے کے لیے
دس دس ہزار مانگتے ہیں اور لڑکی کو یہ اجازت بھی نہیں دیتے کہ وہ آزادی سے کسی کے ساتھ
آجا سکے۔"
لڑکے نے دُرلبھ سنگھ کی طرف بڑی حیرت سے تاکا۔ ٹرک کے اوپر بوریوں پر بیٹھے ہوئے
مزدور اُن کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا: "سردار جی ہم آئیں کچھ مدد کریں؟"
"نہیں، تمہاری ضرورت نہیں۔ میں ہی کافی ہوں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر انہیں منع کر دیا اور
گلابی سے کہا "تو جا اپنا کام کر۔ میں اس لڑکے کو ٹرک پر لاد کر دیا تھانے تک لے جاتا ہوں، جہاں
یہ میرے خلاف رپٹ لکھوائے گا۔ جا جا تو جا" لیکن گلابی وہاں سے نہ ہٹی۔
لڑکے نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔ وہ سائیکل ہاتھ میں لیے ہوئے
ایک طرف چلا گیا تو دُرلبھ سنگھ نے ہنستے ہوئے اپنی مونچھیں سہلائیں اور گلابی سے بولا۔ "آج
تیرے باپو سے صاف صاف کہنا پڑے گا۔ شاید وہ بھی اسی انتظار میں ہو گا کہ [illegible]

کہ کہیں مجھے تو بھی وہاں موجود رہا۔ سمجھی؟"

یہ کہہ کر وہ پھر ٹرک میں جا بیٹھا، اسے اسٹارٹ کیا گیئر دیا اور پھر کھڑکی میں سے سر نکال کر بولا۔۔۔ "دو گھنٹے کے بعد آؤں گا، اسی جگہ ملنا اور سن، یہ لونڈا تیرا راستہ پھر روکے تو اسے میرے مار میں میری طرف سے دو تھپڑ لگا دینا ڈرنا مت، باقی میں آکر سنبھال لوں گا۔"

جاری ہے

اُداس اُداس ستمبر

جب وملا وششٹ ۱۵ رٹیگور مارگ پہنچی تو پانچ بج رہے تھے وسط دسمبر کی سرد ہواؤں والی ایک شام تھی۔ وہ پیلی شیفون کی ساڑی کے اوپر ایک گہرے کلر کا ہاف کوٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔ اگنی ہوتری جی اور اُن کی پتنی کو دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر وہ مسکرائی مسکراتے وقت اس کے گالوں میں بہت ہی دلفر گڑھے پڑ جاتے تھے۔

"آ گئی میری بہن!" مسز اگنی ہوتری نے جوش کے مارے اسے گلے سے لگا لیا۔ اگنی ہوتری کے چہرے پر بھی اسے دیکھ کر قریب قریب اتنی ہی جوشی نمودار ہوئی تھی لیکن اسے تنہا آتے دیکھ کر بہت بے صبری سے بولے۔ "وششٹ جی کہاں رہ گئے؟"

ہاں انہیں ساتھ کیوں نہیں لائی وملا!" مسز اگنی ہوتری کے پینتالیس سال کے بھرے چہرے پر شکایت اُبھر آئی۔

"آئیں گے۔ آئیں گے تو!" وملا مسکراتی ہوئی انہیں یقین دلانے لگی۔

"مگر کب تک آئیں گے؟ جب بارات آ چکے گی؟"

ان دونوں کا ساوتی غصہ دیکھ کر وملا کی ہنسی چھوٹ گئی اس کے گالوں کے گڑھے اور بھی گہرے ہو گئے لیکن وہ اپنی ہنسی کو مشکل تمام تالو میں لاتی ہوئی بولی۔

"اوہ! آپ لوگ تو اس طرح گھبرا رہے ہیں جیسے بارات آ بھی چکی ہو!"

"ارے بھئی یہ سب انتظامات بھی تو ابھی کو دیکھنے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں
ا رہا ہے۔ اگنی ہوتری جی نے گھر کے سامنے لان میں لگے ہوئے خیمے کی طرف اشارہ کیا
جس کے نیچے کرسیوں اور میزوں کو لگایا جا رہا تھا۔ محلے والے یہاں وہاں ملبہ اور
کوڑا صاف کر رہے تھے۔ کام کرنے والوں کی تو وہاں کوئی کمی نہیں تھی لیکن اگنی ہوتری جی
وہاں ایسے ہر ایک آدمی کی موجودگی چاہتے تھے۔

وہ لوگ کبھی دہلی میں ایک ہی مکان میں ساتھ رہتے تھے۔ اسی تعلق نے انہیں
نادر کر دیا تھا۔ مسز اگنی ہوتری ومِلا کو ساتھ لے کر اندر گئیں تو ومِلا کو دیکھتے ہی بہت
سی لڑکیاں اِدھر اُدھر اور اوپر کے کمروں سے مینڈکوں کی مانند کودتی اور اچھلتی ہوئی اس
کے گرد جمع ہو گئیں اور لگیں طرح طرح کے سوالات پوچھنے۔

"آنٹی تم کہاں تھیں اب تک؟"

"ہم آپ کو صبح سے تلاش کر رہے ہیں، پتہ بھی ہے آپ کو!"

"پرستا دیدی آپ کو کتنی دیر سے پوچھ رہی ہیں۔"

"اری مسز وششٹ، مسز گنڈک بھی آئی ہیں۔ آپ کے گھر چلنے کے لئے کہتی تھیں۔
انہوں نے کہا آپ کو فون کر کے بُلا لیں۔ بسکٹوں والے کمرے میں تو اتنا زیادہ لڑکے جمع
ہو گئے ہیں، میں کیا جاؤں۔ دن بھر تتلیوں کو چھوڑا ہی نہیں انہوں نے۔"

ومِلا انہیں دیر سے آنے کا سبب بتاتے بتاتے تھک گئی لیکن پوچھنے والوں کی تعداد
میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جب وہ پرستا کے کمرے میں گئی تو اس نے بھی اس کی طرف ایسی
شکایتی نظروں سے دیکھا کہ ومِلا نادم تو ہوئی ہی لیکن دل میں اس کے لئے بے اختیار
پیار اُمڈ آیا۔ اس نے پرستا کو گلے سے لگا لیا اور اس سے کہا۔

"دیکھو اب تو ہم سے اس طرح نہ روٹھو۔ کل سے تو پرائی ہو جائے گی۔ سسرال
میں ہمیں کو یاد کر کے رویا کرے گی۔ بتا دوں!"

یہ طعنہ سُن کر پرستا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یوں وہ بے حد خوش مزاج لڑکی

تھی۔ سسرال کے نام سے کبھی چڑی تھی۔ اپنے ہونے والے پتی کے ذکر سے اس کے
ساتھ تو ایک ہفتہ پہلے تک گھومتی بھی رہی تھی۔ لیکن پھر بھی کوئی چبھتا ہوا جملہ اس کی آنکھیں
پُرنم سا دیتا تھا۔ اس وقت بھی اسے صدمات سے گلوگیر ہوتے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے
پھر بات کا رُخ بدلنے کے لئے ایک لڑکی نے پیچھے سے وِملا کی گردن کے ساتھ جھول کر کہا۔

"اچھی آنٹی، ذرا پرستا دیدی کا سنگھار کر دیجئے!"

"میں سنگھار کر دوں؟ میں" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہوں آپ ہی آنٹی جی۔ آپ میک اپ کرنے میں بڑی ایکسپرٹ ہیں۔ جیسا
ایسا میک اپ کیا ہوا ہے ویسا ہی ان کا بھی کیجئے۔"

"اری کہاں میں نے میک اپ کیا ہے؟ پاگل ہوئی ہے کیا؟" وِملا جھینپ گئی پھر
متوجہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "میں تو جلدی میں شیشے میں اپنا مُنہ بھی
نہیں دیکھ پائی۔ سچ۔!"

"اجی آپ تو کچھ بھی کریں تب بھی چاند ہی کی طرح چمکتی ہیں" ایک عورت نے دروازے
میں داخل ہو کر کہا اور پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے میک اپ میں مصروف ہو گئی۔
وِملا کے گرد جتنی لڑکیاں جمع تھیں، سب اس کی خوبصورتی کی تعریف کرنے لگیں۔
وہ بار بار کہتی گئی۔ "بس بھئی بس انہیں زیادہ نہ بناؤ۔ بس بابا بہت ہو چکا اب انہیں
معاف بھی کر دو۔"

ایک بار پرستا نے بھی اس کی طرف ستائش بھری نظر سے دیکھ کر کہا۔ "جب
آپ ہیں ہی بے حد خوبصورت تو اس حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں۔ آپ کی جگہ
کوئی دوسری عورت ہوتی تو غرور سے یوں گردن پھلائے ملتی۔"

یہ کہہ کر پرستا نے اپنی گردن کو پھلا کر سب کو دکھا بھی دیا۔ سب لڑکیاں ہنس
پڑیں۔ اسے خوش دیکھ کر وِملا کے دل میں پھر پیار اُمڈا۔ اس کی چوٹی ہاتھ میں لے کر بولی
"چل آج تیرا سنگھار ہی کر دوں؟"

یہ حقیقت تھی کہ وِملا بے حد خوبصورت تھی۔ اس سارے ہجوم میں وہ سب سے

زیادہ دلکش عورت تھی۔ جسمانی اعضا کی مناسبت، روپ، رنگت، لباس، مہک اپ اور اس کے سبھاؤ نے بھی اس کی شخصیت میں ایک شاہانہ شکوہ پیدا کر دیا تھا۔ شادی بیاہ والے گھر میں بیاہی جانے والی لڑکی ہی ہیروئن ہوا کرتی ہے۔ حسن کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور اس کی پسند و ناپسند کی طرف خاص دھیان جاتا ہے لیکن وملا کو وہاں۔ پہنچتے ہی جیسے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سبھی لڑکیاں اور عورتیں اپنے ساؤ سنگھار کے لئے گھڑی گھڑی اسی سے مشورہ لینے لگیں۔

"اس شلوار قمیص کے ساتھ کس رنگ کا دوپٹہ میچ کرے گا آنٹی!"

"مسروستنٹ میں کون سا بلاؤز پہنوں؟ دیکھیے تو!"

"اجی آنٹی ذرا ہمارا بھی ہیئر ڈو دیکھ لیجئے۔ بالوں کو اب کدھر سے لاؤں؟"

اسی اہمیت کے احساس سے وملا کا دل اندر ہی اندر بلیوں اچھل رہا تھا۔۔۔ وہ سے اور مسرور دکھائی بھی دیتی تھی۔ اسی پُرکشش شخصیت کے اعتماد ہی نے اس کے چہرے پر ہوتی اور چمک پیدا کر دی تھی لیکن وہ مغرور نہیں تھی بلکہ اسی نے بیاہ دلکشی ہی کی وجہ سے ہر دم بھی نظر آتی تھی۔ جیسے اس کا بس چلے تو وہ اپنا حسن تھوڑا تھوڑا سب کو بانٹ دے۔

اس نے پرستا کو سنوارنے سجانے میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی۔ لڑکیاں دونوں کی طرف بہت حسرت سے ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہیں۔ بعض نے تو سانس تک روک رکھی تھی۔ وملا اس کے اس انہماک سے بھی بے خبر رہی تھی جبھی اپنے کام میں مصروف ہوئے بھی اس کے چہرے پر کئی کئی رنگ آتے اور جاتے تھے۔

اس گہما گہمی میں دو گھنٹے تو پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ مہمانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ وملا کا پتی اس سے ملنے کے لئے دو ایک بار اندر آیا اور پھر چلا گیا۔ کیوں کہ وہ پرستا کو جے مالا کی رسم کے لئے سجانے میں مصروف تھی۔ وہ چاہتا تھا وملا اس کے ساتھ باہر خیمے کے نیچے جمع ہو چکے ہوئے لوگوں کے درمیان گھومے۔ اس کے کتنے سارے دوست اور ان کی بیویاں جو باہر بیٹھے تھے اس سے وملا کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔

جب بارات دروازے پر آ گئی اور جے مالا پہنانے کی گھڑی بھی آ پہنچی تو وملا

پرستا کو اپنے یاردوں کے حلقے میں لئے ہوئے ایک دوسرے پر گری پڑتی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم کے آگے کھڑی تھی۔ اُن کے سامنے بھی ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ بے حد شوخ، شادماں اور خوش پوش باراتیوں اور دوسرے مہمانوں کا ہجوم۔ پھولوں سے لدے ہوئے دولہا کو بھی قدم قدم چلاتے ہوئے وہاں تک لے آیا گیا تھا۔ پرستا بے چاری اپنی تمام تر فطری شوخی اور آزادی بھول کر سُرخ ساڑی کے اندر ترتم اور گھبراہٹ سے کماں کی طرح جھکی جا رہی تھی۔ وِملا نے کان میں کچھ کہا تو وہ اور بھی جھک گئی۔ باراتیوں کی نظریں گھونگھٹ میں چھپی ہوئی دلہن پر لوچی ہی ہوئی تھیں لیکن انھیں وِملا کے دلآویز نقوش اور خطوط بھی متوجہ کئے ہوئے تھے۔

اچانک بے شمار چہروں کے درمیاں وِملا نے ایک ایسا چہرہ دیکھ لیا اور اِس چہرے پر چمکتی ہوئی دو ایسی آنکھیں دیکھ لیں کہ اس کی ساری مسرت کافور ہوگئی۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ ڈرتے ڈرتے بھی ان آنکھوں کو ایک بار پھر گہری نظر سے دیکھا پھر جیسے اسے یقین آگیا۔ اسے سچ مچ پھانسی کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے اس کے بعد اسے تنہ بھی نہ چلا کر جے مالا کی رسم کب اور کیسے ادا ہوئی۔ کس عورت نے آگے بڑھ کر اس کے یاردوں میں سے پرستا کو سنبھال لیا۔ فوٹو اتارنے والے کیمرے کتنی کتنی بار بجلی کی سی چمک دے کر کلک کلک بولے۔ وہ بمشکل تمام وہاں سے کھسکتی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی ایک کمرے میں جاکر کرسی پر گرسی پڑی۔ اس کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ سب لوگ ابھی تک باہر دُوار پوجا کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے دل کو اتنے زور زور سے دھڑکنے سے روک نہیں سکی ایک عجیب سے خوف سے اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔

دُوار پوجا ہو جانے کے بعد عورتیں واپس آنے لگیں۔ اب وہ پرستا کو واپس لا رہی تھیں۔ لیکن وِملا اُس کمرے میں سے نکل گئی۔ وہ سب کی نظریں بچا کر باہر آگئی، باراتی کھانے کی میزوں کے سامنے جلدی جلدی بیٹھ جانے کے لئے حرکت کر رہے تھے۔ جنھیں جگہ نہیں ملی تھی وہ بڑے بڑے چوڑے اور صاف ستھرے غلافوں والے صوفوں میں دھنس دھنس کر بیٹھ رہے تھے۔

اس نے اپنے شوہر کو تلاش کیا۔ وہ ایک ہی لمحے میں اسے ڈھونڈ لینا چاہتی تھی۔ وسنت اسے دکھائی دے گیا۔ وہ اس کی طرف بیٹھ گئے ہوئے ایک شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وملا ذرا آگے بڑھ گئی۔ پھر جیسے فوراً ہی اس کے پاؤں میں بیڑیاں سی پڑ گئیں۔

اس نے اس آدمی کو پھر دیکھ لیا جس کے ساتھ وسنت باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے سایہ تلاش کیا۔ جہاں روشنی نہ پہنچ رہی ہو۔
ایک قنات کے پیچھے رُک کر اس نے ایک لڑکے کو روکا اور وسنت کو بلا لانے کے لئے کہا۔

وسنت وملا کے پاس پہنچا تو اسے دیکھتے ہی کہہ اٹھا۔ "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ چلو تمہیں ستھاچاریہ سے ملاؤں۔ میرا بہت ہی پیارا دوست آج ایک لمبی مدّت کے بعد اچانک مل گیا ہے۔ وہ میری بیوی کو دیکھنے کے لئے بے حد بے قرار ہے۔ چلو چلو!"

"سنیے"۔ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ وملا نے وسنت کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کر کے چونک پڑا۔ حیران ہو کر پوچھا۔
"تمہیں کیا ہوا، وملا؟"
"میری طبیعت اچھی نہیں ہے، اس وقت!"
"اسٹرینج!! ابھی ابھی تو تم بالکل بھلی چنگی تھیں! میں نے تمہیں اندر عورتوں کے ساتھ خوب قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔"
"ہاں۔ تب میں واقعی ٹھیک تھی۔ اب میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مسز اگنی ہوتری پوچھیں تو بتا دیجئے گا کہ۔"
"لیکن تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"نہ جانے کیوں اچانک ہی دل گھبرانے لگا ہے۔"

"تو چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن ورا ارکو۔ ابھی ہوتری کو بتا دوں۔"

"نہیں نہیں آپ ٹھہرے۔ ابھی تو مہمان لوگ پہنچے ہی ہیں۔ اُن کی میلوا کیجیے۔ میں گھر جا کر آرام کرتی ہوں۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وہ جس وقت اُسے رکشا میں بٹھا رہا تھا یہ تاکید بھی کرتا جا رہا تھا۔ "ضرورت پڑے تو ڈاکٹر مصرا کو فون کر دینا۔ نوکر کو بھی جگا لینا۔ میں یہاں سے بیٹ کر پہنچتا ہی ہوں۔ مجھ گئیں نا، ہاں، الماری میں وہ سٹیتی بھی رکھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔"

وہ گھر پہنچ کر سیدھی سونے کے کمرے میں گئی۔ بستر میں لیٹ گئی۔ نہ ڈاکٹر کو بلایا نہ نوکر کو جگائے رکھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ تنہائی اور خاموشی تاکہ وہ یہ سوچ سکے کہ وہ اب کیا کرے؟ اس کے بیڈ کے قریب، میز پر رکھے ہوئے ہیرا اور مونج کے پورٹریٹ بھی اس کی تنہائی میں مخل ہو رہے تھے۔ اس کے دونوں بچے نینی تال کے کونوٹ میں تعلیم پاتے تھے۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھ کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس آدمی کو دیکھتے ہی وہ اپنے بچوں سے کتنی دور ہو گئی تھی! ایک لمحے کے اندر، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہر چیز اس سے دور ہو گئی تھی۔ بچوں اور پتی کے علاوہ اس گھر کا آرام اور سکون تک جس کے اندر وہ خود کو بہت ہی محفوظ سمجھتی تھی۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ڈھونڈ رہا ہو گا پچھلے پندرہ برس سے دنیا کا کونہ کونہ چھان رہا ہو گا کہ وہ اسے پھر مل جائے۔ جس دنیا کو اس نے بہت بڑی بتایا تھا اور یہ وشواس دلایا تھا کہ وہ اسے کبھی تلاش نہ کر سکے گا وہی دنیا ومِلا کو اب بہت چھوٹی معلوم ہو رہی تھی۔ کوئی کسی سے بچھڑ کر بہت دنوں تک الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ دنیا اتنی محدود ہے کہ کوئی کسی سے چھپ کر رہ ہی نہیں سکتا۔

ستمبر کی ایک سہانی رات تھی۔ پچھلے بارہ سال سے وہ ہر ستمبر میں اداس ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلے بارہ سال سے وہ مسوری بھی نہیں گئی تھی۔ جو مسوری اس کے حوالوں میں بسا رہتا تھا اب اس کے نام سے بھی اسے چڑ تھی۔ اس کے پتی نے کئی بار وہاں جانے کے لئے ضد کی تھی لیکن مسوری کا نام سنتے ہی وہ جھلا اٹھتی تھی۔ "مسوری! مسوری!"

مسوری!!! ارے جائے مسوری سے آپ کو اتنا پیار کیوں ہے، مجھے نہیں اچھا لگتا یہ مُوا مسوری، آپ نہیں رہ سکتے تو جائیے اکیلے ہی ہو آئیے۔" اتنا کہہ چکنے کے بعد وہ رونے بیٹھ جاتی تھی۔

وسنتسٹ اُسے اور بچوں کو ہندوستان کے ہر پہاڑی مقام پر لے گیا تھا، کبھی مئی جون میں، کبھی ستمبر کے مہینے میں۔ وہی ستمبر جو ہر سال آتے ہی وملا کے دل و دماغ پر ایک بھیانک پر اسرار دہشت کی ماند اپنے ستہ پر پھیلا لیتا تھا لیکن شادی ہو جانے کے بعد ایک بار بھی وسنتسٹ اسے مسوری نہیں لے جا سکا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس نہ تھا صرف حیرت تھی۔ وملا نے اس کی حیرت دور کرنے کی کبھی کوشش نہ کی اپنے دل کے اندر ہی ہر ستمبر کی آمد پر ایک خطرے کی لمحہ بہ لمحہ اپنے قریب آتا ہوا محسوس کرتی رہی۔ بالکل اسی رگ جاں کے قریب، جیسے کوئی دکھائی نہ دینے والی طاقت اُس کا گلہ گھونٹ دینا چاہتی ہو۔

وہ ہانپتا ہوا، ایک پہاڑی راستے پر اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا کہہ رہا تھا "میں ـــ میں تلاش کرتا رہا۔ تم وہاں سے کب چلی آئیں؟ میں نے سارا کلب چھان مارا، میں ـــ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ـــ لیکن مجھے ـــ کچھ مہلت دو۔ صرف چند منٹ کی مہلت، میں اپنی سانس برابر کر لوں!"

اندھیرے میں، اوپر مال تاپ کے کسی مکان میں سے آتی ہوئی بہت ہی دُھندلی روشنی میں، وہ اس کے سامنے بت کی طرح کھڑا رہ کر پھر ایک بیلیا پر بیٹھ گیا۔ سر جُھکا کر پیچھے دیکھنے لگا گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کھائیاں اور چٹانیں اور دُور جھلملاتی ہوئی وادی دُوں کی روشنیاں جو ستمبر کے مہینے میں پہلے سے زیادہ رومانی ہو گئی تھیں۔

کلب میں سے وہ بہت ہی افسردہ ہو کر باہر آئی تھی۔ وہ وہاں کے بیوٹی کنٹسٹ کی امیدوار نہیں تھی، لیکن بنگال کے جوائنٹ سکریٹری کی بھتیجی الاچکر ورتی کے مس مسوری چن لئے جانے کے بعد وہ یکایک افسردہ ہو گئی تھی۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ اپنے اندر اُٹھنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں اپنے اور دوسرے ملکوں کے

کتنے ہی لوگ، مرد اور عورتیں جمع تھے لیکن اسے کوئی بھی ایسا دکھائی نہیں دیا تھا جن لڑکیوں کو وہ جانتی تھی وہ اسے اپنے من پسند مرد کے ساتھ ناچنے کے لئے چل دی تھیں۔ وہ چاہتی تو اسے بھی کوئی مرد اپنے بازوؤں کے حلقے میں لئے لئے ہال روم میں پہنچ جاتا لیکن وہ وہاں سے چپکے سے کھسک آئی تھی۔ اپنی رہائش گاہ کی طرف اکیلی ہی چل دی تھی۔
رہائش گاہ میں اس کا ریٹائرڈ انجینئر باپ اپنے ایک ہم عمر پڑوسی کے ساتھ برج کھیلنے میں مصروف تھا۔ پگڈنڈی پر جگہ جگہ پتھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ ان پتھروں سے ٹکرا نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اس کے چلنے کے انداز پر لڑکھڑانے کا گماں ہوتا تھا۔ وہ بار بار سر اٹھا کر ایک طرف کی اونچی پہاڑیوں پر اُگے ہوئے اونچے گھنے پیڑوں کو تکتی تو سرے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اندھیرے میں عظیم بھکشوؤں کی اونچی اونچی مورتیوں کی مانند معلوم ہوتے تھے جنہیں بڑی بڑی تاریک گپھاؤں کے اندر چٹانوں کو تراش تراش کر بنایا جاتا رہا ہے۔ اس وقت تو سارا مسوری ہی ایک وستال گپھا کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اس وستال گپھا کے اندر وہ چپ چاپ، اداس اداس سی تنہا گھومتی پھرتی تھی۔ جیسے گھومنے کا کوئی مقصد نہ ہو اور کوئی منزل بھی نہ ہو، دل کو ایک نامعلوم سا دلاسا دینے کی خاطر ہی وہ بھٹکتی پھرتی ہو!
اس نے چلتے چلتے پوری آستینوں کا ہرا سویٹر پہنا۔ اس کے کھلے بازوؤں کو سردی لگنے لگی تھی۔ جن بالوں کو سنوارنے میں اس نے شام کئی گھنٹے صرف کر دیئے تھے انہیں بھی چلتے چلتے ہی کھول ڈالا۔ انہیں ایک لمبی بے ڈھنگی چوٹی میں سمیٹ دیا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں پیچھے سے کسی کے بھاگ کر آنے کی آواز آئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئی تھی۔
اس ٹیلا پر بیٹھ کر وہ اس کی بہت ہی مدھم لیکن بہت ہی مدھر آواز میں باتیں سنتی رہی تھی۔ اس کی ساری باتوں میں وملا کی خوبصورتی کا ذکر تھا۔ جو لصورتی کی تعریف تھی وہ مقابلۂ حسن میں شریک ہونے کے لئے نہیں گئی تھی۔ اسے اپنے آپ ملکۂ حسن بھی نہیں مانا گیا تھا لیکن اس اجنبی نے وملا ہی کو بیوٹی کوئن قرار دیا تھا۔ یہی بات اس سے

ملنے کے لئے وہ اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا تھا

تعریف بہت ٹرالتہ ہے۔ سر پر چڑھ جاتا ہے تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس وقت انسان اتنا بھی نہیں دیکھ پاتا وہ کس کے ہاتھوں میں ہے اکس کے کندھوں پر سوار ہے وہ ہاتھ اور کندھے اسے اٹھائے اٹھائے کہاں کہاں تک لے جائیں گے اکس گہرے گڑھے میں جا پھینکیں گے' وہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ اندھیرے میں وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھ پائی وہ یہی کہتا رہا ہم ایک دوسرے سے پھر نہیں ملیں گے۔ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہی رہیں گے۔ یہ زندگی اتنی تلخ ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں وہ ایک دوسرے سے اجنبی رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں' اس نے اس کا عاشق ہونے کا دعویٰ کیا۔ نہ عاشقی پر اس کا یقین ہی تایا۔ اُس نے خود کو وِملا کا ایک گمنام مداح کہا جس سے پھر وہ کبھی ملنے کا کوئی امکان نہیں دیکھتا تھا۔ دنیا اتنی بڑی ہے اتنی وسیع ہے کہ لوگ اپنے آپ سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اچانک ہی بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ تو اس سے جان کر ہی الگ ہو رہا تھا۔ کبھی بھی نہ ملنے کا یقین دلا رہا تھا۔

خاموش اور اندھیرے پہاڑی راستے پر وہ اس کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھا رہا تھا دیر تک اس کے ساتھ رہا اسے عجیب سے سپنے دکھائے جب اس سے جدا ہوا تو سارے سپنے واپس لے گیا۔ اس کے پاس صرف خوف ہی خوف چھوڑ گیا۔ ایسا خوف جو اس سے پھر کبھی الگ نہ ہو سکا۔ وہی خوف اس اجنبی کا ہیولہ بن گیا۔ بے نام بے شکل۔ اور سنگ دل بھی۔ اس کی یاد آتے ہی وِملا کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی اور اس طرح جلدی جلدی سکڑنے اور سمٹنے لگتی تھی جیسے اس کا تصور بھی ایک زہریلا کیڑا ہو جس سے خود کو بچانا بہت ضروری ہو'

جن آنکھوں کو دیکھ کر وہ اچانک سہم گئی تھی ویسی آنکھیں اس نے پہلے بھی کئی بار دیکھی تھیں وہ گھورتی ہوئی نظر کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ جاتی تھی ۔ بالکل کانپنے لگ جاتی۔ نہ جانے اندھیرے میں جب وہ اجنبی اسے ملا تھا اس نے وِملا کو کیسی نظر سے دیکھا تھا لیکن اس کے اندر کے خوف نے اسے ایک خاص طرح کی چبھتی ہوئی

نظر کا تصور دے دیا تھا۔ آج تو اسے یقین ہو چکا تھا۔ یہ وہی نظر ہے وہ اس کے حلقے میں پھنس گئی ہے۔ اب اس کے حلقے کو توڑ کر نکل جانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔
اچانک اس نے اپنے کمرے میں کسی کی چاپ سنی۔ گھبرا کر سر اٹھایا۔ وسنت بہت دھیرے دھیرے چلتا ہوا آرہا تھا۔ وہ اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وسنت اس کے پاس آبیٹھا۔ بولا "کیسی ہو؟"
"اچھی ہوں!"
"ڈاکٹر مصرا کو بلایا تھا؟"
"نہیں اسے بلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں!"
"اچھا تم سوؤ۔ آرام کرو۔ آرام سے سوؤ گی تو صبح تک بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ صبح اُٹھتے ہی تمہیں میرے دوست سے ملنا ہوگا۔ بھٹاچاریہ سے۔ وہ میرے ساتھ ہی آیا ہے۔ باہر کے کمرے میں ہے۔ رامو اس کے لئے بستر لگا رہا ہے۔"
یہ سن کر وہ کانپ گئی۔ اس کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا وسنت کمرے سے جاتے وقت اس کی کیفیت نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگا تھا۔ اس نے ریفریجریٹر کھول کر صبح کے ناشتے کے لئے کھانے کے سامان کا جائزہ بھی لیا پھر رامو کو بلا کر صبح سویرے ہی کچھ ضروری چیزیں لے آنے کی ہدایت کر دی۔ چند منٹ کے لئے باہر کے کمرے میں گیا۔ پھر لوٹ کر اسی کمرے میں آگیا۔ جہاں وملا سو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ملے ہوئے دوسرے پلنگ پر آہستہ سے لیٹ گیا۔ ایک آدھ منٹ کروٹیں بدلیں پھر گہری نیند سو گیا۔
وملا جاگتی رہی۔ اسے نیند نہیں آئی اسے اپنے بچے یاد آتے رہے۔ پراؤر مسوج لومبر میں ان کے سالانہ امتحان ختم ہو جاتے تھے۔ دسمبر میں وہ گھر لوٹ آتے تھے لوٹتے تھے تو اپنے ماں باپ سے مل کر بے حد خوش ہو جاتے تھے۔ ماں باپ کے دل کی بھی وہی کیفیت ہوا کرتی تھی، سبھی ماں باپ اپنے بچوں سے مل کر مسرور ہو جاتے ہیں۔ وہ ان سارے والدین کے چہرے یاد کر سکتی تھی جنہیں وہ نیلی تال ایکسپریس کو ریسیو کرنے

کے لئے اسٹیشن پر آیا ہوا دیکھا کرتی تھی۔ وملا کو ابھی اور وسنت ٹ کی ساری بے قراری یاد تھی۔

بچّوں کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر کروٹ بدل لی۔ سامنے اس کا شوہر لیٹا ہوا تھا۔ صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر۔ پہلے جب کبھی اس کا جی اس طرح افسردہ ہو جاتا تھا تو وہ ایک کروٹ سے اسے شوہر کے چوڑے سینے سے جالگتی تھی۔ وسنت نے اسے کبھی اداس نہیں ہونے دیا تھا۔ کبھی آزردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی خاطر وہ ساری دنیا کو زیر کر سکنے کی ہمت رکھتا تھا۔ محبت کرنے والا شوہر بھی کیسا بیوی کو حوصلہ دیتا ہے لیکن اسے اپنے شوہر کے خلوص پر کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً اس کے لئے ایسا کر بھی سکتا تھا لیکن اب تو وہ اسے اپنے سے اتنا دور معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے قریب کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی اور روتی رہی۔ چپکے چپکے روتی رہی نہ جانے اتنے آنسو اس کی آنکھوں میں کہاں سے آگئے تھے۔ آنسوؤں کے تھمنے کا نام نہیں لیا۔ اس کے منہ سے سسکی نکلنے کو ہوتی تو وہ جلدی سے تکیے کا کونہ منہ میں دبا لیتی تھی۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ وہ اتنی غم زدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل پاش پاش ہو چکا تھا۔

اچانک اسے اپنے سینے پر پڑا ہوا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی بھاری چٹان اسی جگہ سرک گئی ہو۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اوپر چھت پر اور اپنے آس پاس۔ اس کا شوہر ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ چہرے کو ایک بازو سے ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پلنگ سے پاؤں لٹکا کر۔ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا ہوا دونوں بچّوں کا پورٹریٹ اُٹھا لیا۔ اندھیرے ہی میں انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ تصویر کو سینے سے لگا کر ایک گہری سانس لی پھر تصویر کو اسی جگہ پر رکھ کر وسنت کے پلنگ کے پاس گئی۔ ذرا فاصلے پر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ بالکل کھوئی ہوئی سی۔ جیسے کوئی اپنے دیوتا کے سامنے کھڑا رہتا ہے لیکن وسنت اسی طرح گہری نیند سوتا رہا۔ وملا دھیرے دھیرے چل کر دروازے تک گئی ایک پٹ کھول کر آکاش کی

طرف غور سے دیکھا۔ ابھی صبح ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے تاروں کی چمک دیکھ کر اندازہ لگایا تین ساڑھے تین ہی بجے ہوں گے۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے بیچ میں کھڑی رہی۔ ایک دو بار سر گھما کر بھی دیکھا۔ اپنے شوہر ہی کی طرف دیکھا۔ پھر یکایک پلٹ کر اس کے پاس چلی آئی۔ درشن پر گھٹنے ٹیک کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے ندی کا سد ٹوٹ گیا ہو اور روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔ دستنت چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ وملا کو اپنے قدموں کے ساتھ لپٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو گھبرا کر پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا؟ وِملا، وملا! تمہیں کیا ہوا؟ کہیں تم نے کوئی بھیانک سپنا تو نہیں دیکھ لیا، وِملے!"

ہچکی ہچکیوں کے درمیان وملا نے شوہر کو بتایا — "مجھے معاف کر دیجئے — میں اب — زندہ نہیں رہنا چاہتی!"

اس کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر دستنت کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک وہ بالکل سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ پھر اسے یاد آیا۔ وملا کل شام سے پریشان ہے وہ کل ہی سے اسی کیفیت میں ہے اس نے وملا کو فرش پر سے اٹھا کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لینا چاہا۔ کہا۔ "بات کیا ہے؟ سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں میری قسم! تمہیں کون سا دکھ ہے؟"

وِملا نے اس کی گود میں سر رکھ کر روتے روتے اس اجنبی کی بات بتائی جو ابھی تک اُس کی جان کے درپے ہے۔ یہی کل رات اُسے بارات میں دکھائی دے گیا تھا اسی کو دستنت اس گھر میں مہمان بنا کر لے آیا ہے۔ وہ اس کے سامنے جانے سے بجائے اپنی جان دے دینا چاہتی ہے۔

اپنے گناہ کے اعتراف نے اسے اور بھی دل شکستہ کر دیا۔ وہ اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔

دستنت اس کی بات سُن کر کتنی دیر تک خاموش رہا۔ بالکل عجیب! اندھیرے میں وِملا اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ اسی کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس

نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ بھر کر بولا۔ "تو تم اس اجنبی کو بھٹاچاریہ سمجھ بیٹھی ہو! کیوں ؟ جس اجنبی کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا وہ بھٹاچاریہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ بھٹاچاریہ کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت ہی نیک اور اچھا انسان ہے۔ وہ کبھی ہمارے پردیس کے گھر میں آیا ہی نہیں ہے۔ اُس کی ساری زندگی بنگال، بہار اور بمبئی میں گزری ہے لیکن جس بُرے آدمی سے تم اتنا ڈر رہی ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں۔ کہو تو ابھی بُلا کر لے آؤں ؟ لیکن تم وعدہ کرو کہ اسے دیکھ کر جان دے دینے کا ارادہ ترک کر دو گی۔"

وِملا نے چونک کر اس کی گود میں سے سَر اُٹھا لیا۔ اسے یقین نہ آیا۔ وسنت جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب سچ ہے۔

وسنت کچھ دیر تک پھر خاموش رہا جیسے اور کچھ کہنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ اسی وقت ماہرستاند صبح کی پہلی کرن بھی پھوٹی۔ کیونکہ اُن کے اندھیرے کمرے میں بہت ہلکا سا اُجالا ہو گیا اور وسنت نے تھوک نگل کر کہا "تم اس آدمی کو کبھی پہچان نہ پائیں، وہ تو تمہارے ساتھ ساتھ ہی رہا ہے۔"

وِملا بالکل گونگی سی ہو کر اور سُن سی ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس سے پوچھنے کی ساری طاقت کھو بیٹھی۔

وسنت نے اس کے نرم ڈھیلے بالوں میں اپنا چہرہ ڈبو کر کہا "مجھے ڈر تھا تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی، اسی لئے کبھی بتایا نہیں۔"

+

بڑے باپ کی بیٹی

اپنی ازدواجی زندگی کے چھ سالوں میں پہلی بار میلو ترا نے اس کا اعتراف کیا کہ اُس نے ریلوے کے گارڈ جیس ترا کے ساتھ شادی کر کے واقعی سخت غلطی کی تھی۔ ایسی غلطی کہ جس کی اب کوئی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ پچھلے چھ سال کے واقعات نے نہ صرف اُس کے دل و دماغ پر گہری خراشیں لگا دی تھیں بلکہ ان کے واضح اثرات بھی اُس کے چہرے پر دیکھے جا سکتے تھے۔

وہ صرف تئیس سال کی تھی۔ تئیس سال اور نو دن کی۔ آہستہ آہستہ اور رک رک کر باتیں کرنا اس کی عادت میں داخل رہا تھا لیکن اب وہ بولتی تھی تو اُس کے انتہائی دُکھی اور حساس ہونے کا پتہ چل جاتا تھا۔ پہلے اُس کے رُک رُک کر بولنے کے پیچھے جذبات کی ایک فراوانی سی موجود رہتی تھی۔ اب اُس کی جگہ ایک عجیب سی احتیاط نے لے لی تھی۔ جیسے اب وہ صرف وہی کچھ کہے گی جس کی اُسے ضرورت ہے۔ بلا ضرورت ایک لفظ بھی ادا نہیں کرے گی بلا ضرورت کوئی حرکت بھی نہیں کرے گی نہ مسکرائے گی، نہ مڑ کر دیکھے گی، نہ ہی کسی پر اپنی نگاہ غلط انداز تک ڈالے گی جس کے سامنے بڑے بڑے ثابت قدم بھی لڑکھڑا جاتے تھے۔

جس وقت اُس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا اعتراف کیا اُس دن وہ اپنے میکے میں اپنے بڑے بھائی دیا ناتھ ملہوترا کے سب سے چھوٹے لڑکے ڈم کے رتھ ڈے

میں شامل ہونے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ شہر میں موٹروں اور ٹرکوں کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹر ملہوترا کی کوٹھی کے وسیع اور قسم قسم کے پیڑوں اور پودوں کی خوشبوؤں سے مہکتے سبزہ زار میں سیکڑوں مہمان جمع ہو چکے تھے۔ پُر لطف باتوں اور اونچے قہقہوں سے پوری فضا گونج رہی تھی۔ خوشنما چہروں، رنگ برنگی ساڑیوں، دوپٹوں اور اعلیٰ تراش کے کوٹوں اور سوٹوں کی ایسی افراط تھی کہ کسی ایک پر نگاہ ٹھہرانا ایسا مشکل تھا لیکن کوٹھی کے الگ تھلگ کمرے میں اپنے پانچ سال کے بچے مکی کی میز کے بٹن بند کرتے وقت سوترا کا دھیان بار بار اپنے شوہر کی طرف جا رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ وہاں آئے گا بھی نہیں۔ کبھی نہیں آئے گا۔ چھ سال کے عرصہ میں وہ صرف دو تین بار ہی اس گھر میں آیا تھا۔ جو اعتراف وہ اپنے ماں باپ بھائیوں اور بہنوں کے بار بار طعنے دینے کے باوجود نہیں کر سکی تھی وہ آج اُس سے بے ساختہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے سے کہا تھا "تیرے ڈیڈی بہت بُرے ہیں۔ بہت ہی بُرے مکی!"

اُس نے یہ بات انتہائی دکھی ہو کر کہی تھی۔ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی اُمڈ آئے تھے، جیسے ہوا کے تیز جھونکوں سے ساون کی بدلیاں آناً فاناً پورب سے پچھم جا پہنچیں۔ اس وقت اُس کے جسم پر سفید جارجٹ کی سنہرے بارڈر والی ساڑھی تھی۔ بال سنوارنے میں اُس نے بڑی لاپروائی سے کام لیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی لمبی گردن کے پیچھے سیاہ ریشمی بالوں کی ڈھیری بہت دلکش معلوم ہو رہی تھی۔

اُس کا جی دعوت میں شامل ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ لان پر پہنچ گئی وہ مکے میں اسی مقصد کے لئے ہی گئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی پروفیسر بھرُوچہ کی مسز اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور حیران ہو کر بولیں "میلو تمہیں کیا ہوا؟ تم بہت کمزور دکھائی دے رہی ہو۔"

انتوکا سین، ارشاد املاع اور سوستیلا بھوٹانی نے بھی اُسے گھیر لیا۔ اُس سے طرح طرح کے سوالات پوچھے سوشل اجتماعات میں شامل نہ ہونے پر، بیمار دکھائی دینے پر اور اُس کے شوہر چیں ترا کے آج اس تقریب میں موجود نہ ہونے پر۔

وہ کسی کے سوال پر تو مسکرا دیتی اور کسی کو مختصر سا جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی۔ کسی کا دھیان بالکل ہی دوسری طرف پھیر دینے کے لئے وہ اُس کے گلے میں پہنے ہوئے زیورات کی تعریف کرنے لگتی تھی۔

"اوہ! ہاؤ لولی! کتنا پیارا ہیں ہے، معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی کسی فارن لیسٹ سے امپورٹ ہوا ہے۔"

"مسز سنہا! تمہاری ساڑھی کا یہ کلر تمہارے آداس چہرے پر بہت کھل رہا ہے!"

"اوہ، ہیلو سردار جی! کیسے آج آپ کی مسز کہاں ہیں؟ کیا یہاں آ گئی ہوئی ہیں؟ تب تو آپ بہت لونلی فیل کرتے ہوں گے!"

رنگ و لو کے ہجوم میں اس سرے سے اُس سرے تک وہ اسی قسم کے جملے کہتی ہوئی گھوم گئی جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ ایسی پارٹیوں کی سب سے بڑی دلکشی ہوا کرتی تھی۔ جب سے اُس نے سولہویں میں قدم رکھا تھا، ممی اور ڈیڈی اُسے خاص طور پر لوگوں سے متعارف کرانے کے لئے ساتھ لے جاتے رہے تھے جیسے آج سول سروس کا نوڑھا میجر اپنی دختر شہلا اسلام کو ڈپٹی کلکٹر خورشید کے ساتھ ملا رہا تھا اور چالیس برس کا سرخ و سفید ڈپٹی کلکٹر شہلا اسلام کے قیمتی غرارے اور دوپٹے کے دلفریب رنگوں کے علاوہ اُس کے حدید فیشن سے تراشے ہوئے سُرخ بالوں کو بھی بڑی گہری نظر سے دیکھے جا رہا تھا۔

ایک میز پر اُس کی چھوٹی بہن سیما، موسح کے ساتھ بیٹھی کسی گہری گفتگو میں کھوئی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

اس کے اونچے قد کی حسین و جمیل بھابی کتھئی رنگ کی ریشمی ساڑھی میں اپنے شوہر کے ساتھ گیٹ پر کھڑی آنے والے مہمانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک ایشیائی ملک کے محکمۂ اطلاعات کے ایک افسر کی بیوی میں بیوی ہندوستانی لباس ساڑھی اور بلاؤز پہنے چلی آ رہی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے مال خاص ـــ امداد سے اُس کے ماتھے اور شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سب لوگوں کی نگاہیں اُسی کی طرف بے اختیار اُٹھنے لگی تھیں۔

لان میں مہمانوں کی میزوں کے بیچوں بیچ بجاس کے قریب بچے جمع تھے۔ ایک میز پر ڈم کو ملے ہوئے تحائف کا ڈھیر لگا تھا۔ دوسری میز پر بڑے ماڈل کی ایک موٹر کار کا ایک خوبصورت کیک سا ہوا رکھا تھا کیک کے سب کل پُرزے میٹھے اور لذیذ تھے جو سب بچوں میں تقسیم کئے جانے والے تھے۔

مینو تنہا کی نظر لیے بیٹھی رہی۔ پر جانے جوں ہی سب بچوں سے الگ تھلگ ایک کرسی کی پشت پر اپنے ذات گارڈ سے بڑی اُداس نظروں سے اُس کیک کی طرف دیکھ رہا تھا وہ جلدی سے اس کے پاس گئی۔ اُسے پیار کیا۔ پچکارا۔ اُسے بچوں کے درمیان لے جاکر وہاں چھوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا تو اُسے انگلی سے تھام کر باہر لے گئی۔ وہ مکی کی اُداسی کا سبب جانتی تھی۔ اُس کے کسی جنم دن پر نہ کبھی اتنا بڑا اجتماع ہوا تھا نہ ہی اتنا بڑا اور دلکش کیک آیا تھا۔

مینو نے اُس کا دھیان بجلی کے رنگ برنگے قمقموں کی طرف لے جانا چاہا بڑے بڑے پودوں کے اندر جگمگاتی ہوئی ٹیوبوں کی طرف۔ اور دور تک سڑک کے کنارے رُکی ہوئی کتنی ساری موٹروں کی طرف۔

مکی دیکھ تو یہ کار کتنی لمبی ہے!"

مکی گن تو یہ سب کاریں کتنی ہوں گی؟"

یکایک اُس نے محسوس کیا وہ مکی کے بجائے اپنا من بہلانے کی کوشش کر رہی ہے وہ ہجوم کے اندر کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ تنہا ہو جاتی تو خود کو پھوٹ پھوٹ کر رونے سے باز نہ رکھ سکتی۔ اب بھی وہ اپنے آنسوؤں کا باندھ بمشکل تمام روکے مکی سے پوچھ رہی تھی "تو گنتی کیوں نہیں سناتا؟ ون، ٹو، تھری۔!"

دعوت ختم ہو جانے کے بعد وہ ماں باپ کی کار میں ہی اُن کے گھر سے روانہ ہوئی۔ اُس کے پاس مٹھائیوں کے دو بڑے بڑے پیکٹ تھے۔ وہ جانتی تھی کہ جیس ان ڈبوں کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھے گا۔ انہیں اس کے ہاتھ سے چھین کر دیوار یا فرش پر دے مارے گا۔ وہ اُس کی میکے سے لائی ہوئی چیز دیکھ کر یا اُس کے ماں باپ کا ذکر سنتے ہی ایک عجیب سے

غصے کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ گھر کی چیزوں کو توڑنے پھوڑنے کے لئے اُس کے ہاتھ بے چین ہو اُٹھتے۔ اُسے لے جانے کے لئے اُس کے ماں باپ کے گھر سے تیسرے چوتھے دن کار آ جاتی تھی۔ جمی اس بات کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ وہاں جھپٹ کر جاتی۔ جب جمی گھر میں نہ ہوتا۔ گاڑی کے ساتھ کہیں باہر گیا ہوا ہوتا۔ لیکن پھر بھی اُسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ اُسے بھی کوستا اور اپنے سسرال والوں کے خلاف بھی جو بات اس کی زبان پر آتی اُسے بلا جھجک بک دیتا تھا۔ اُن کی کہیں بھی بُرائی سنتا تو اُس کا چہرہ ایک عجیب سی مسرت سے چمکنے لگتا تھا۔ سینما اور مسوح کے قصے کو بڑھا چڑھا کر اپنے دوستوں میں سناتا رہتا تھا تاکہ اُن کی زیادہ رُسوائی ہو

یہ وہی جمی تھا جس کے ساتھ اُس نے اپنے سارے خاندان کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اُسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اُس کی ہو کر رہ گئی تھی نینی تال کے فلیٹس پر وہ کئی لڑکیوں کے ساتھ میں الصوبائی ٹورنامنٹ کا فائنل دیکھنے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی ٹینس کی کھلاڑی تھی۔ ٹینس کے کھیل میں کتنے خوبرو نوجوان اس کے پارٹنرز بن چکے تھے لیکن اس کی نظر میں کوئی نوجوان اس قدر نہیں جچ سکا تھا جتنا ناروں ریلوے کا چیمپئن جمی ستارا ۔۔۔ ایک اونچے پیڑ کی طرح ایستادہ اور مضبوط کسی پہاڑ کی طرح پھیلے ہوئے اس کے شانے۔ اور گھٹنوں تک پہنچنے والے لمبے لمبے بازو۔ جن کے حصار میں نہ جانے کیا کچھ نہیں آ سکتا تھا ایک دنیا پوری دنیا۔ لیکن اس نے جمی کو دیکھ کر خود کو ساری دنیا کے مقابلے میں بہت حقیر اور چھوٹا محسوس کیا تھا۔ جمی کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک مسحور کر دینے والی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر بھی رکھتا تب بھی ان کے کسی نہ کسی گوشے سے مسکراہٹ پھیل ہی پڑتی تھی۔

کھیل کے تمام مدارج طے کر جب کامیابی جمی ہی کے سر بندھا تھا وہ دوسری سب لڑکیوں کے بالکل پیچھے ہاتھ میں آٹو گراف بک اور پن لئے کھڑی یہ سوچ سوچ کر کانپ رہی تھی، نہ جانے جمی مجھے کس نگاہ سے دیکھتا ہے 'میری طرف دیکھتا بھی ہے یا نہیں! اگر جمی نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں بے ہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ میں آٹو گراف لئے بغیر ہی کیوں نہ

بھاگ جاؤں ،

نہ جانے کس شریر لڑکی نے اُسے پیچھے سے اچانک دھکا دے کر باقی سب
لڑکیوں سے آگے کر دیا اور جیمی بھی اپنے سامنے ایک سترہ سال کی سمندر کی طرح گہری اور
نیلی آنکھوں والی دبلی پتلی لڑکی کو دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے اس سے
اپنے ماتھے پر بار بار اُڑتی ہوئی بالوں کی آوارہ لٹیں ہی نہیں سنبھالی جا رہی تھیں۔ وہ
اُسے گھورتے گھورتے بڑی بے رحمی سے ہنس پڑا تھا اور اس کے ہاتھ سے آٹو گراف
لینے کر اس پر ایسی بے پیاری سے قلم گھمایا تھا کہ میو کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہر چیز گھومتی
ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ جیسے اوپر کی چیزیں نیچے پہنچ جائیں اور نیچے کی اوپر۔ وہ تو
خیر ہوئی کہ لڑکیاں اُسے چھیڑتی اور ہنستی ہوئی ہجوم میں سے باہر نکال کر لے آئیں ورنہ وہ
وہیں مر ہی چلی تھی۔

لیکن کچھ روز بعد اسی نینی تال میں وہی میو ملہوترا اپنے خاندان کی دولت و عزت
کا سارا مدار بھول کر دو اڑھائی سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے نچلے متوسط طبقے کے
ایک ریلوے گارڈ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی دکھائی دینے لگی
تھی۔ ورجینیا وولف، جیمز جوائس ٹیگور اور کرشن چندر کا ادب پڑھنے والی لڑکی سر سبز
پیڑوں سے ڈھکے ہوئے اور گہرے سایوں میں ڈوبے ہوئے پہاڑوں کی بستیوں میں جمی ترا کے
پاس بیٹھ کر گھنٹوں بڑی دلچسپی سے اُس کے گاڑیاں چلانے اور انہیں کنٹرول کرنے
مسافروں کی دھکا پیل سے کامیابی کے ساتھ نپٹنے اور اپنے افسران بالا کی بے جا سختیوں
کی عجیب و غریب داستانیں سننے لگی تھی اس کی نظر میں جمی ہی ایک مکمل مرد تھا مردوں
کی دنیا کا واحد مرد جس کی علامتیں وہ محسوس کر سکتی تھی اُسے دیکھتے ہی وہ بالکل
پسپا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس طرح پسپا ہرگز نہ ہوئی ہوتی اگر وہ اس سال نینی تال نہ گئی ہوتی۔
وہاں جا کر جیمی سے نہ ملی ہوتی۔ اُس کے اپنے ماحول میں کئی لڑکے تھے جو اس کا ہاتھ تھامنے
کے لئے بے قرار رہتے تھے لیکن ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں تھا جیسا جمی تھا۔
وہ جیمی کو اپنے ماحول میں لے جا کر ان سب کو شکست دینا چاہتی تھی۔ جیمی

اسی پرشکوہ شخصیت کی بدولت اس کے ماحول میں اسے لئے ایک قابلِ احترام جگہ پا سکتا تھا جس بھی اسے بے پناہ چاہتا تھا۔ پانچ وٹ کی دبلی پتلی اور رٹر کی مانند نرم و نازک عورت نے اپنے پیار سے اس دیو قامت شخصیت کو اپنے لئے ایک ماہی بے آب کی طرح بے چین کر رکھا تھا۔ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے لئے میںو ہی سب کچھ تھی۔ وہ گھر سے دور کسی گاڑی کے ساتھ ڈیوٹی پر ہوتا تو میںو کے تصور ہی میں ڈوبا رہتا تھا۔ تنہائی میں اُس کے ساتھ باتیں کرتا تھا کبھی کبھی تو راستے ہی میں کسی اسٹیشن پر گاڑی چھوڑ کر اور جھوٹ موٹ بیمار پڑ جانے کا بہانہ بنا کر دوسری گاڑی سے گھر لوٹ آتا تھا۔ میںو کو احساس تھا کہ وہ اس کے ساتھ بالکل سودائیوں کی سی محبت کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ خوش تھی مطمئن تھی۔ اس کی محبت پر ناز کرتی تھی۔ جس اس زمانے میں بھی اُس کے ماں باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ انہیں وہ مغرور اور متکبر بتاتا تھا۔ اُسے اس بات کا سخت رنج تھا کہ انھوں نے اس شادی کی مخالفت کی تھی۔ نہ صرف مخالفت بلکہ شادی کے موقع پر اُسے ذلیل بھی کیا گیا تھا۔ اُس کے براتیوں کا استقبال اس شان سے نہیں کیا گیا تھا جو اُن کی اونچی شان کے شایاں ہوتا۔ وہ کسی امیر خاندان سے ہوتا تو سسرال سے اُسے جہیز میں موٹر اور دوسرا بہت سا قیمتی سامان ملا ہوتا لیکن اُسے غریب سمجھ کر بہت معمولی سامان کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا اس واقعے پر میںو اور اُس کے درمیان کئی بار بات ہو چکی تھی۔ میںو یہ بھی جانتی تھی وہ بہت بڑے جہیز کا خواہش مند نہیں تھا لیکن وہ اس حقیقت کو بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اُسے غریب سمجھ کر اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس کی نفرت بڑھ گئی تھی۔ اب تو اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ وہ اُن کی کسی تقریب میں شامل ہونا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ لوگ اُسے ملانے آتے تو جس انھیں گالیاں ۔۔ دینے پر اتر آتا۔ وہ جس کو نہیں ملاتے تب بھی وہ انھیں کوستا تھا۔

میںو ایک عجیب دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ نہ ماں باپ کو چھوڑ سکتی تھی نہ اپنے شوہر کو۔ اپنے میکے کی ہر تقریب اُسے ادھوری اور بے کیف لگتی تھی۔ بے کیف بھی

اور تکلف دہ بھی۔

ریلوے کالونی کے پاس پہنچ کر اس نے کار رکوالی۔ وہ ہمیشہ یہیں سے کار
واپس بھیج دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ کار والوں کو عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ایک
ہاتھ میں مٹھائی کے پیکٹ اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے مکی کو تھامے ہوئے ایک ہی
طرح کے بنے ہوئے کوارٹروں کے ایک طویل سلسلے میں داخل ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے
تنگ اور تنگ و تاریک صحن۔ کسی کسی دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ۔
بیشتر دروازے ویران اور اُجاڑ اُجاڑ ، زرد رنگ کی روشنیوں سے بھرے ہوئے
کمروں میں نظر آنے والی عورتیں خاموش جھگڑالو، موٹی بھدّی اور حسین ہر طرح کی
عورتیں تعلیم کی کمی سے مرجھائے ہوئے چہرے۔ معمولی لباس کے کھلے ہوئے جسم چھوٹے
اور بڑے سب اپنے ماحول کی ہر چیز قبول کرتے تھے۔ اس کا اثر لیتے تھے نفرت بھی
لیا کرتے تھے محرومی، مایوسی، کمینگی اور زندہ رہنے کی جدوجہد۔ زندگی کی وردی میں تو
لپٹے ہاں بگولے کی طرح گھومتا ہوا ملتا اور کوئی کوئی چہرہ ایک عجیب سی مکّاری اور
خودداری لئے ہوئے، یہاں کے لوگ مستقبل سے زیادہ حال کے مسائل میں ڈوبے رہتے
تھے مسائل جو اُن کے لیے ہوتے تھے۔ بالکل ذاتی۔ جن کا تعلق صرف زندہ رہنے
سے ہوتا تھا۔

سوتر ا دو طرح کی دنیاؤں میں گھومتی تھی۔ ایک وہ جو اُس کے ماں باپ کی
اور امیر لوگوں کی تھی، دوسری وہ جو اُس کے سوسر جیسے لوگوں کی تھی۔ ایک دوسرے
سے میلوں دور۔ کبھی نہ ملنے والے فاصلے۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دوسرے
کے مقابل صف آرا دو عظیم قوموں کے درمیان وہ ایک بے بس سفیر کی طرح گھوم رہی تھی
دونوں کو اور اس کے چاہنے والے سفیر کی طرح لگی جس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ رکھتا ہو۔
وہ اپنے کوارٹر کے سامنے پہنچی تو اُس کا جی چاہا مٹھائی کے پیکٹ باہر دروازے
پر ہی چھوڑ دے۔ کسی کی آوارہ گھومتی ہوئی بکری اُن کی خاردار تاروں سے بنی ہوئی باڑھ
میں سر گھسائے مولیوں کے پتے توڑ توڑ کر چبا رہی تھی۔ مکی نے اُسے ہش ہش کر کے

دور بھگا دیا۔

کوارٹر کے اندر اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں بھی روشنی نہیں تھی۔ غسل خانے کے زنگ آلود پائپ میں سے پانی کی ایک تیز دھار اوپر کی طرف اچھل اچھل کر ٹین کی چھت کو چھو رہی تھی اور ایک مسلسل اداس گیت گا رہی تھی۔ اس نے مٹھائی کے ڈبے برآمدے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی چارپائی کے بان پر رکھ دیئے اور اس کمرے میں گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس اندھیرے کمرے میں رکھی ہوئی ہر ایک چیز سے مانوس تھی بلکہ کرسیاں، کپڑوں کی الماری اور جوتوں کے ریک۔ لیکن وہی چیزیں جیسے ہاتھ میں تیز دھار کے ہتھیار لئے اب اس پر وار کرنے کے لئے گھات لگائے ہوئے ہوں اس کے ایک قدم آگے بڑھاتے ہی وہ اس پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑیں گی۔

مکی سہما ہوا اس کے ساتھ لگا کھڑا تھا وہ چند لمحوں تک اندھیرے کمرے میں بے حس و حرکت کھڑی رہی پھر دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگے بجلی کے سوئچ کو ٹٹولا، ٹک، کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں اجالا پھیل گیا اور اسے ایک کونے میں کرسی پر لیٹا ہوا ایس دکھائی دیا۔ سفید قمیص پہنے جس کا ایک حصہ اس کی میلی پتلون پر سے نکلا ہوا تھا۔ ایک آستین کہنی سے اوپر تک الٹی ہوئی تھی اور دوسری کا کھلا ہوا کف نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکائے چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ اسے دور سے دیکھتی رہی۔ مکی باپ کے پاس چلا گیا۔ لیکن اس کے ذرا فاصلے پر رک گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس گئی اس کا جی ڈوب رہا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ماں باپ کے ہاں سے لوٹ کر آتی تھی اس کا جی اسی طرح ڈوبا کرتا تھا۔ جس اسی طرح شراب پئے ملتا تھا۔ شراب پی کر وہ خوب چلاتا تھا۔ اسے اس کے ماں باپ کی امارت تنگ دلی، خود غرضی اور رکیک‌پن کے طعنے دیا کرتا تھا۔ اس کی آواز پوری کالونی سنتی تھی جہاں کا کوئی شخص ہیلو کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا تھا وہ انتہائی دکھی ہو کر رونے لگتی تھی۔ رات رات بھر روتی رہتی تھی کبھی جس اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا تو وہ اسے پیار کرنے لگتا تھا۔ اپنے سلوک کے لئے معافی

مانگتا تھا۔ وہ جتنی شدت سے نفرت کرتا اتنی ہی شدت سے پیار بھی کرتا تھا۔

میو اُس کے پاس ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گئی جپ چاپ سر جھکا کر وِسّ کو گھورنے لگی۔ جِم کے بوٹ گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے اِن کی پالش غائب ہو چکی تھی۔ ن کے ایک بوٹ کا تسمہ کھلا ہوا تھا۔ اُس کی غیر حاضری میں وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا تھا۔

میو نے اُس کے بازو کو چھوا۔ چاہا کہ اُس کے اُلٹے ہوئے کف کو ٹھیک کر دے۔ دوسری آستین کی طرح اُسے بھی بازو کی کہنی تک اٹھا دے لیکن اچانک جِم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو کھینچ لیا۔ میو کا دل اپنی جگہ سے اکھڑ کر حلق میں آ پھنسا، اس نے دانتوں کے درمیاں ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں دے کر خود کو چیخنے سے روکا۔ جِم اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا وہ مِکّی کو گھور رہا تھا جو سہما ہوا سا پاس کھڑا اُس کی حرکت بغور دیکھ رہا تھا اپنے باپ سے مشابہہ، اسی جیسی رنگت اور مزاج بھی۔ یکایک مِکّی باپ کے بالکل پاس سہم گیا اور اُس کی ناک پر انگلی ٹکا کر بولا "ڈیڈی تم بولتے کیوں نہیں؟"

میو ڈر گئی۔ ایسے موقع پر وہ بچے کی پرواہ بھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے غصّے کی کیفیت میں کئی بار مِکّی کو ایک طرف دھکیل دیا تھا۔ اس کا جی چاہا ہاتھ بڑھا کر مِکّی کو اپنی طرف کھینچ لے لیکن اُس کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی جِم نے مِکّی کو اُٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اُسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "مِکّی مِکّی پیارے، تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تیرے ساتھ نہیں بولوں گا، بول، تو نے یہ کیوں کہا؟"

میو نے جِم کے لہجے میں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ محسوس کی جیسے وہ بڑی کوشش سے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکے ہوئے ہو۔ آج اُس کے منہ سے شراب کی بُو نہیں آ رہی تھی۔ آج وہ شراب پیئے ہوئے نہیں تھا وہ اُٹھ کر اُس کی پشت کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں گھمائیں لیکن وہ مِکّی کو پیار کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھرے ہوئے تھے جو اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ مِکّی کے کان میں جیسے کچھ کہہ رہا تھا۔

"اس سال ہم بھی مکّی کا برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔ اسی کالونی کے سارے بچوں کو بلائیں گے جتنے بھی بچے یہاں رہتے ہیں۔ کیوں مکّی، لولی سب کو بلاتے گا نا؟"

مکّی خوشی سے چیک کر بولا "ڈیڈی، ڈیڈی ڈم کے گھر میں اتنی بڑی موٹر کا کیک تھا۔ اتنا بڑا کیک" اُس نے بازو پھیلا کر کیک کی ضخامت کا اندازہ بتایا۔

جمی بولا "ہم اپنے بیٹے کے لئے کیک کی ریل گاڑی بنوائیں گے۔"

"سچ ڈیڈی؟ آہاہا اب تو بڑا مزا آئے گا۔" وہ خوش ہو کر تالی بجانے لگا لیکن پھر کچھ سوچ کر اُداس ہو گیا اور بولا "ڈیڈی ہم ڈم کو نہیں بلائیں گے۔ آج ڈم میرے ساتھ بولا بھی نہیں۔ باقی سب لڑکوں کے ساتھ بولتا تھا۔"

یہ سُن کر جمی نے سر گھما کر میںو کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ گردن کی رگیں تن گئی تھیں آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے لیکن اسی لمحے میں میںو دونوں ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور روتے روتے بولی "نہیں مکّی ہم اُس گھر کے کسی آدمی کو اپنے ہاں نہیں بلائیں گے۔ وہ اپنے آپ آجائیں گے تب بھی میں اُنھیں باہر نکال دوں گی۔"

جمی اور مکّی دونوں حیران رہ گئے۔ جمی مکّی کو اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ آنکھوں میں غصّہ کی جگہ پیار امڈ آیا لیکن اس پیار میں کھسیاہٹ زیادہ تھا وہ بڑی کوشش سے مسکرایا اور بولا "لیکن اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ا

لاحاصل خوابوں کی گنتی

میں اپنے گھر میں پیلا سر لیو استو کی موجودگی کی وجہ سے خاصا پریشان رہنے لگا ہوں۔ کبھی کبھی نروس بھی ہو اٹھتا ہوں جس کی کوئی معقول وجہ نہیں نظر آتی۔۔۔ وہ یہاں موجود نہیں ہوتی تب بھی میری کیفیت یہی رہتی ہے جب سوچتا ہوں تو اس میں اپنی ہی حماقت زیادہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے دُبلی پتلی، ماڈرن اور ساڑھے پانچ فٹ کے قریب اُونچی۔

وہ دوسرے تیسرے دن کسی تالاب کی چکنی مٹی ایک پلاسٹک کے بورے میں بھر کر اپنی موپیڈ کے پیچھے لادے ہوئے آجاتی ہے اور مجھے ایک خاص زاویے پر اپنے سامنے بٹھا کر مٹی کے تودے کو گھنٹوں مولڈ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ اپنی پتلی پتلی لانبی انگلیوں سے گیلی مٹی پر میرے خط و خال بنایا کرتی ہے۔ اور میں بت سا بنا کسی ایک سمت دیکھتا رہتا ہوں۔ جس طرف وہ چاہتی ہے۔ اس کی مرضی کے بنا میں ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ صرف سوچ سکتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت میری یہی ایک عملداری رہ جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُس میں بھی وہ دخل انداز ہو جاتی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو بابا!"

"مٹی کے بارے میں"

"کون سی مٹی بابا!"

"یہی مٹی۔ جو کچھ تو ہماری پکڑ میں ہے اور کچھ پکڑ میں نہیں آسکی۔"
"میری پکڑ سے باہر کون سی مٹی رہ گئی ہے اب؟"
"یہ میں ہوں میلا، جس کا تم ابھی تک کچھ نہیں بگاڑ سکیں" یہ کہہ کر میں کھل کھلا اٹھتا ہوں۔ اور سر گھما کر اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں تو وہ مجھے ڈانٹ دیتی ہے۔
"ارے رے رے! تمہیں ہلنے کی اجازت کس نے دی بابا؟ ابھی سر بالکل مت گھماؤ۔ سمجھے!" وہ آگے بڑھ کر مٹی میں سنے ہوئے ہاتھوں میں میرا سر تھام لیتی ہے اور مجھے پھر سے اسی زاویئے پر بٹھا کر اپنے کچے مواد کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ مجھے اپنی باتوں میں لگائے رکھنے کے لئے پوچھتی ہے۔
"تم اپنے آپ کو مٹی کیوں کہتے ہو بابا!"
"تو اور کیا کہوں؟ مٹی ہی کا تو ایک تودہ ہوں۔"
"سو تو ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس مٹی میں ابھی کتنی جان ہے، کتنے رنگ ہیں اور کتنی حرارت اور"
"اور کیا؟"
"اور ــــ بہت بڑا دماغ بھی۔"
"لیکن جو جو قسمتی سے تمہاری طرح نہیں سوچ سکتا ہے۔"
میں پھر قہقہہ مار کر ہنسنا چاہتا ہوں لیکن وہ پہلے ہی خطرہ بھانپ لیتی ہے۔ "دیکھو دیکھو! ایسی بات پر اب مت ہنسنا۔ اگرچہ یہ بات مجھے بھی بہت اچھی لگی ہے۔"
میں آنکھوں کے کونوں سے دیکھ لیتا ہوں۔ وہ میری طرف سادہ سی، مسکرائے اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کے بال اس کے چہرے کے آس پاس جھول رہے ہیں۔ اس نے اب ایک بڑا سا سر مولڈ کر لیا ہے۔ چہرے پر جو داڑھی ہے وہ ہو بہو میری ہوتی ہے۔
"مجھے ایسا لگتا ہے اب صرف میری آتما کے منتقل ہونے کی دیر باقی ہے جو سر سے نکل کر تمہارے بنائے ہوئے اسکیچو میں چلی جائے گی۔ اس کے بعد مجھے

لے کار سمجھ کر پھینک دیا جائے گا۔"

"اگر تم واقعی بہت تھک گئے ہو تو میں تمہیں چند منٹ کے لئے سگریٹ پینے کی اجازت دے سکتی ہوں۔"

اس کا لب و لہجہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ ایک ستر برس کے بوڑھے پر اپنا پورا نصف جما چکی ہے۔ میں ایک فلسفیانہ خاموشی سے اُسے پیڈسٹل کے پاس سے ہٹتا ہوا دیکھ کر اطمینان سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اُس کی طرف شکرگزار آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں۔ "سگریٹ ہی نہیں۔ ایک پیگ بھی پیوں گا۔"

"وہ بھی دے سکتی ہوں لیکن مہربانی کر کے اسی جگہ بیٹھے رہو۔"

وہ ایک کپڑے سے مل مل کر اپنے ہاتھ صاف کر رہی ہے۔ پہلے سگریٹ کی ڈبیا اٹھاتی ہے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں لگاتی ہے ایک میرے ہونٹوں میں اور پھر دیا سلائی سے سلگا کر میری کتابوں سے بھرے ہوئے ایک ریک کی طرف بڑھ جاتی ہے اُسے معلوم ہے میری لائبریری کے کونے کونے میں کتابوں کے پیچھے ڈرائی جن کی بوتل موجود ہے وہ میری طرف پیٹھ گھمائے کچھ منٹوں تک گلاس بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ میں اس کے سڈول جسم کی طرف تاکتا رہ جاتا ہوں جس پر پرانی جینز اور ایک کھلا کھلا ٹاپ ہے پتہ نہیں وہ کون سے لمحے تھے جنہوں نے عمروں کے اس فاصلے کو اچانک مٹا دیا تھا میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اچانک ہاتھوں میں دو گلاس لئے ہوئے پلٹ آتی ہے ایک گلاس میرے ہاتھ میں دے کر خود نامکمل مجسمے کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھتی ہے پھر چند منٹ گہری خاموشی میں نکل جاتے ہیں اور پھر اچانک اُسے یاد آتا ہے۔

"ابھی تک انل نہیں آیا!"

"اُسے کہاں سے آنا تھا؟"

"اُسے میوزیم سجانے کا کام مل گیا ہے۔ کہتا تھا دو بجے تک لنچ پیکٹ لے کر پہنچ جاؤں گا۔"

"تمہیں بھوک لگی ہے!"

"ایسی زیادہ تو نہیں۔ آجائیے تو کچھ دیر کے لئے تمہیں بھی چھٹی مل جائے گی۔"
آج کی تاریخ میں اس گھر میں نہ اُس کا پہلا قہقہہ گونجا ہے وہ نظر نائٹری تنوع اور ہمسوڑ واقع ہوئی ہے لیکن جب وہ اپنے کام میں مہمک ہوتی ہے تو میں اُس کے قہقہوں کی اُسی گونج کے لئے ترستا رہتا ہوں ایک رُخ سے ساکت بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اُس سے دراد یر کے لئے تھوڑی سی ہنسی کی بھیک ہی مانگ لوں لیکن ایسا نہیں کرسکتا جانتا ہوں وہ اتنی آسانی سے نہیں کھلنے والی لیکن وہ ایک ایسی سخی ضرور ہے جو بن مانگے ہی جھولی بھر دیتی ہے۔ لیکن صرف فرصت کے لمحوں میں۔ اور جب اُس کے ساتھ اہل بھی ضرور ہو۔
تیس سال ہوئے وہ میرے ایک جرنلسٹ دوست کا سفارشی خط لے کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اُسے آرٹ کالج میں داخلہ چاہیے تھا۔ میں پرنسپل سے کہہ کر اس کا کام کراسکتا تھا لیکن میں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر اُسے چند روز کے لئے ٹال دیا تھا۔ دراصل اُس نے پہلی نظر میں مجھے بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔ اُس کا وہ حلیہ اب بھی کبھی کبھی یاد آتا ہے تو مسکرا دیتا ہوں۔ معمولی سی شلوار، قمیض اور سر پر آدھا اوڑھا ہوا دوپٹہ۔ اور گردن میں اُلجھی ہوئی چھوٹے چھوٹے بالوں کی پتلی سی چوٹی اور دونوں ہاتھوں میں ایک فائل جس میں اس کے سرٹیفکیٹ وغیرہ تھے۔
وہ دوسری مرتبہ آئی تو میں نے بڑی بے دلی سے پوچھا "تم آرٹسٹ بن کر کیا کروگی؟"
اُس نے میری طرف بڑی بڑی حیران و اُداس آنکھوں سے تاکا تھا اور مجھ پر اسی لمحہ یہ منکشف ہوا تھا کہ اُس کی یہی آنکھیں اُس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہیں لیکن اُس کی ساری شخصیت سے یہ آنکھیں یکسر الگ تھیں۔ جیسے یہ آنکھیں وہ کسی اور سے مانگ کر لے آئی ہو۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ پہلی ملاقات کے وقت اُس نے میری طرف اس طرح کیوں نہیں تاکا تھا۔ اب چونکہ میں آنکھوں کی وسعت اور اُداسی میں بالکل ڈوب کر رہ گیا تھا اس لئے اپنے سوال کو خود ہی بھول کر اس کی آرٹ کے تئیں فطری دلچسپی معلوم کرنے کے لئے دوسری باتیں چھیڑ بیٹھا تھا۔

"تم کرسٹل آرٹسٹ ملنا پسند کروگی یا تخلیقی آرٹسٹ۔ تم ایٹریٹر ڈیکوریشن INTERIOR DECORATION کا کورس کیوں نہیں کرلیتیں۔ آج کل لڑکیوں کے لئے یہ پیشہ بھی زیادہ نفع بخش ثابت ہورہا ہے کسی اسکول کے بچوں کو آرٹ سکھانے کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم آرٹ کے بارے میں مضامین لکھنے کی مشق کیا کرو۔ اس طرح آرٹسٹوں میں تمہاری اہمیت بہت جلد بڑھ جائے گی۔ اچھا، کیا تم ہندوستان کے قدیم مندروں کا دورہ کرنے کی ہمت کرسکتی ہو؟ مجھے یقین ہے جب تم چھ سات ماہ کے بعد لوٹ کر آؤگی تو خود کو بہت بدلا ہوا پاؤگی۔"

میری آخری بات کا جواب اُس نے یہ دیا تھا "میں تو خود کو ابھی سے بدلتا ہوا محسوس کرنے لگی ہوں سر!"

اگرچہ اُس نے یہ بات ڈرتے ڈرتے ہی کہی تھی لیکن اُس کی آواز میں ایک اعتماد کی جھلک بھی موجود تھی۔ مجھے اپنی طرف مسکراتا ہوا پاکر اُس کی آنکھیں بھی ہوتی اور اُمید سے پلک ہر یک بھر گئی تھیں۔ میں نے اُسے اُسی روز ساتھ لے جاکر آرٹ کالج میں ایڈمیشن دلوادیا تھا۔ واپسی پر وہ مجھے اپنا گھر دکھانے کے لئے ٹیکسٹ تبھی لے گئی تھی اُس کے ممی و ڈیڈی ویسے ہی تھے جو عام طور پر چھ سات بچوں کے ماں باپ ہوتے ہیں اُن کا گھر بھی ویسا ہی ایک گھر تھا جیسا نچلے متوسط طبقے کا تنگ و تاریک گلیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس ماحول کی پیداوار تھی جس میں مذہبی اور سماجی زندگی کی بے پناہ گھٹن ہوتی ہے۔ وہاں کچھ مکان بوسیدہ تھے کچھ بالکل نئے بنے ہوئے۔ میں نے پرانے مکانوں میں بھی کئی لڑکوں اور لڑکیوں کو جدید و دلکش لباس پہن کر کالجوں اور یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور بعض نئے تعمیر شدہ مکان کی کھڑکیوں میں بہت ہی بدصورت چہرے دیکھے وہ اپنے گرد و پیش میں غریبی، مذہبی جنون اور بار بار بچے پیدا کرنے والی عورتوں کو دیکھ دیکھ کر اکتا چکی تھی۔ وہاں زیادہ تر عورتیں اپنے مردوں پر ہی انحصار کرتی تھیں اور یہ سب اُسے ناپسند تھا۔ بیلا پر یوں سوچے اپنے گرد و پیش سے فرار پانے کے لئے ہی آرٹ کا سہارا لیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں کررہی ہے۔

اُس کے بعد وہ مجھ سے لگ بھگ چھ ماہ کے بعد ملی تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ اظہار کی دوڑ میں اپنے آپ سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ انسان اپنا اظہار کئی طریقوں سے کرتا ہے لباس، اطوار اور باتیں۔ وہ تو جیسے ایک لڑکی تھی جو اب خاصی دلکش اور اسمارٹ نظر آنے لگی تھی۔ اور اس کی اسکیچ بُک میں اُس کے تخلیقی سفر کی پوری داستان موجود تھی۔ اُس نے بہت کم وقت میں بے شمار لوگوں کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا ہر شخص نہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے بلکہ اپنے رویّے سے بھی دوسرے سے بہت مختلف نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی پینسل کی آڑی ترچھی لکیروں سے اپنے محلّے کی اکھڑ راماش کے پاٹھ اور محرّم کے تعزیے کو نئی گہرائیاں اور نئے پھیلاؤ دے دیئے تھے۔ ایک گلی میں آر پار ٹنگی ہوئی صرف جھنڈیاں وہاں کی پوری تہذیبی زندگی کی علامت بن گئی تھیں۔ اُس کے ہاتھوں سے کاغذ پر اُترا ہوا چہرہ اپنی حقیقی زندگی سے کہیں زیادہ اہم بن گیا تھا۔

اتفاق سے اُن ہی دنوں میں اور میری بیوی کچھ دنوں کے لئے اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے مدھیہ پردیش جا رہے تھے۔ اور ان ہی دنوں اتفاق سے ایک قابل بڑھئی بھی خالی ہو گیا تھا جس سے میں نے اپنی لائبریری کے لئے نیا فرنیچر بنوانے کا ایک سال پہلے وعدہ لے رکھا تھا۔ لیکن اب میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کام کی نگرانی کر سکتا۔ اس وقت میلا ہی نے میری مدد کی۔ اور ساری ذمّہ داری اپنے اوپر لے لی جب میں سفر سے لوٹا تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ میری لائبریری میں نہ صرف نئے صوفے، کرسیاں، میزیں اور کتابیں رکھنے کے لئے نئی ریک اور نئی الماریاں بنائی جا چکی تھیں بلکہ اُن پر رنگ و روغن بھی کر دیا گیا تھا اور میری ہزاروں کتابیں ایک نئی ترتیب سے سجا دی گئی تھیں۔ ایک دیوار پر میلا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا ایک بڑے سائز کا اسکیچ بھی آویزاں کر دیا تھا جس میں اُس نے اُسی بڑھئی کو بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کام کرتے ہوئے دکھایا تھا۔

"اب تم اتنی بالغ ہو چکی ہو کہ اپنا گھر بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال سکو۔"

میری بات سُن کر وہ ایک عجیب سی ادا سے ہنس پڑی تھی۔ ادا کسی بھی عمر کی عورت کی ہو اُس کی دلکشی ایک سی ہوتی ہے۔ اور وہ حُسن پرست انسان کو یکساں طور پر

راغب کر لیتی ہے۔ میں نے اس کی پیٹھ پر بڑے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا" اِس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ جب بھی چاہو ملا روک ٹوک آ سکتی ہو۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم اپنا ہوم ورک یہاں میری لائبریری ہی میں آ کر کیا کرو۔"

وہ کئی لمحوں تک میری لائبریری کو سر گھما گھما کر دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کوئی ایسا کونا تلاش کر رہی ہو جسے وہ اپنے لئے مخصوص کر سکے۔ پھر اُس نے خود ہی دو ریک اِدھر اُدھر سرکا کر درمیان میں اپنی میز لگانے کے لئے جگہ بنائی تھی۔ بجلی کے تار خود ہی جوڑ میز کے عین اوپر ایک لیمپ سٹینڈ لگایا تھا۔ لیمپ سیڈ کے سامنے کچھ دیر تک بے مقصد بیٹھے رہ کر اُس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا تھا۔ اور پوچھا تھا "کیا دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے پہلی مرتبہ ایک گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا "بیلا تمہاری آنکھیں دیکھ کر میں ہمیشہ سوچ میں ڈوب جاتا ہوں۔ ایسی آنکھیں میرے گھر میں کسی کی نہیں ہیں۔۔۔ میری بیوی، میری بیٹیاں کسی کی بھی نہیں۔ شاید میں بھول سا گیا ہوں لیکن ایسی آنکھیں میں نے پہلے بھی کہیں نہ کہیں دیکھی ضرور تھیں۔"

"امل بھی یہی کہتا ہے۔ بالکل یہی بات!"

امل کے نام سے میں اُس روز پہلی بار آشنا ہوا۔ مجھے صدمہ بھی محسوس ہوا تھا کہ میری طرح کسی اور نے کیوں سوچا تھا!

"وہ کون ہے؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"مجھ سے تین سال سینئر ہے۔ بہت اچھی مورتیاں بناتا ہے۔ انعام بھی پا چکا ہے۔ اخباروں میں اُس کی بنائی ہوئی مورتیوں پر آرٹیکل چھپے ہیں۔ کسی روز اسے یہاں لے آؤں؟"

میں نے بہانہ بنایا۔ "ابھی نہیں۔ ادھر مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔ کسی نئے آدمی کو ملا کر میں ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا۔ پھر کبھی سہی!"

ایک مہینہ گزر گیا۔ وہ قریب قریب ہر روز آتی تھی۔ مجھے لکھنے پڑھنے میں مصروف دیکھ کر دھیرے سے ہیلو کہتی تھی اور اپنی میز کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔ وہ دو ایک بار

میں جاکر جائے یا کافی بنا کرلے آتی تھی۔ کبھی کبھی میری بیوی کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے باہر دھوپ میں جا بیٹھتی تھی۔ ہمارے گھر میں اُس کا وجود ایک رگ کا سا بن چکا تھا کبھی کبھی وہ میری بیوی کے ساتھ بازار بھی چلی جاتی تھی اور اُس کے ساتھ راشن اور دوسری چیزوں کے بھرے ہوئے تھیلے اٹھائے ہوئے لوٹتی تھی۔ پھر اچانک وہ چھ ماہ کے لئے باہر چلی گئی۔ جنوبی ہند کے ایک شہر سے اُس نے مجھے ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھجوایا تھا جس کی پشت پر اس نے صرف اتنا لکھا تھا " ابل کا اور میرا وقت بہت اچھی طرح کٹ رہا ہے۔ ہم نے بہت سے مندروں اور قدیم گپھاؤں کی مورتیاں اور فریسکو دیکھے ہیں "۔

اس زمانے میں آرٹ سے میرا تعلق ایسا تھا جیسا کسی بھی شخص کا ایک مشہور شہر میں اپنے پڑوسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ میلا سے ذہنی طور پر اور قریب ہونے کے لئے میں کئی بڑے فرانسیسی اور اطالوی آرٹسٹوں کے بارے میں کتابیں خرید لیا۔ اُن کے دور کی تخلیقی تحریکوں کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کیا اور میرے گھر میں میلا اپنے آرٹ کے جتنے نمونے چھوڑ گئی تھی اُن کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون لکھ کر ایک مقامی اخبار کو بھجوا دیا۔ اتفاق سے وہ مضمون فوراً شائع ہو گیا۔ میلا سر پر استوا ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی اس لئے اُسے اپنے متعلق چھپے ہوئے میرے مضمون کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت سے مجھے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے آرٹ گیلریوں میں ہونے والی نمائشوں کے دعوت نامے موصول ہونے لگے میں ایسی کئی نمائشوں میں گیا تو وہاں کئی بڑے اور چھوٹے آرٹسٹوں کے ساتھ دوستی استوار ہو گئی۔ ان کے درمیان میں ایک اہم شخصیت بن گیا۔ میں اپنی پسند کی کئی پینٹنگز اور مورتیاں خرید لیا۔ بعض چیزیں مجھے تحفتہً بھی ملیں لیکن اُن سب کو میں اپنے یہاں جمع کر کے یوں محسوس کرتا جیسے یہ سب میلا ہی کے لئے ہوں۔ میں نے جتنی کتابیں خریدی تھیں وہ سب کی سب میلا کی میز پر جمع ہو رہی تھیں۔

ایک روز اچانک وہ واپس آ گئی۔ سیدھے میرے یہاں آئی۔ اُس کے ساتھ انل ٹھاکر بھی تھا۔ دونوں بے حد خوش تھے۔ انل کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ وہ بالکل میرا ہم شکل تھا۔ لیکن میں بوڑھا ہو چکا تھا اور میرے چہرے پر بہت

گھنی ڈاڑھی مونچھیں اُگی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے سیلا مجھے دیکھ کر کبھی بہن جیسی تھی اس
بات کا احساس اس کو بھی نہ ہو سکا۔ لیکن میں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا دونوں کی شاندار
دعوت کی۔ میری لائبریری ان دونوں کے قہقہوں اور گانوں سے گونج اٹھی۔ اس لیے گٹار پر
ایک بہت ہی رومانی گیت گا رہا سیلا بھی اُس کا ساتھ دیتی رہی۔

LIVING LIFE IS LOVING YOU
EVERY TIME WE SEE EACH OTHER THROUGH
TOGETHER WE WILL FIND A LOVE
TO SHARE WITH OTHERS TOO
EVERY TIME YOU SEE ME HANGING DOWN
YOU HOLD ON TIGHT WITH ALL YOUR MIGHT
YOUR LOVE WILL BRING ME ROUND

میں سمجھ گیا وہ ایک دوسرے کی محبت میں پوری طرح گرفتار اور سرشار ہیں۔ میری
لائبریری ان کے ملنے کے لئے ایک بہترین آرامگاہ بن گئی۔ میں گھر پر موجود نہ ہوتا تب بھی
وہ دونوں وہاں رہ کر پینٹنگ کرتے رہتے تھے اس سے وہ مورتیاں بنانا بھی سیکھ رہی
تھی۔ وہاں چھوٹی بڑی، مکمل اور نامکمل کئی مورتیاں جمع ہو گئی تھیں جو کتابوں کے درمیان
بہت ہی اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا آرٹ اور ادب دونوں ایک دوسرے کے
ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔ لیکن ایک دن سیلا کالج سے اکیلی واپس آئی تو بہت اُداس
تھی۔ اُس روز اُس کا کام کرنے میں بالکل جی نہ لگا۔ میرے بہت پوچھنے پر اُس نے
آنکھوں میں آنسو بھر کر بتایا۔ "اس نے مجھے دھوکا دیا ہے میں سمجھی تھی اب وہ مجھے ہمیشہ اپنے
ساتھ رکھے گا۔ میرے ساتھ شادی کرے گا اُس نے وعدہ بھی کیا تھا لیکن اُس نے اچانک
ارادہ بدل لیا ہے۔ اُس نے کہا ہے، وہ اپنے ہی جیسی کسی آرٹسٹ کے ساتھ ہرگز، ہرگز
شادی نہیں کرے گا بلکہ کسی ایسی سیدھی سادی عورت کے ساتھ جو اُس کے آرٹ کے بارے

میں ایک بھی تعریفی جملہ نہ کہہ سکتی ہو۔"

"کیا مطلب ؟" — میں حیران سا رہ گیا۔ میلا خاموش رہی اور میں اُس کے صدمے کو اپنی رگوں میں شامل ہوتا ہوا محسوس کرتا رہا۔ پھر کئی منٹ کے بعد میں اُس کیمت پر قابو پا کر بولا۔ "وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ تم سے شدید محبت کرتا ہے۔ وہ تم ہی سے شادی کرے گا"

مگر میلا کو میری باتوں سے ذرا سا بھی اطمینان نہ مل سکا وہ روتی رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔

اُس کے بعد ایک عرصہ تک امل ٹھاکر میرے گھر نہیں آیا۔ میلا آتی تھی۔ اپنا کام ختم کر کے لوٹ جاتی تھی میں نے دونوں کو پھر سے ملا دینے کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ اپنے گھر میں میلا کی بنی ہوئی مورتیوں اور پینٹنگز کی ایک نمائش کا اہتمام کیا۔ اُس موقعہ پر کئی نامور آرٹسٹوں، آرٹ کے نقادوں، ادیبوں اور آرٹ کے شیدائیوں کو مدعو کیا۔ دعوت نامہ امل ٹھاکر کو بھی بھجوایا۔ مجھے پوری اُمید تھی، وہ ضرور آئے گا۔ چند گھنٹے خاصی رونق رہی۔ پچاس ساٹھ کے قریب لوگ آ گئے تھے۔ لیکن اُن میں ہمارے شہر کا مشہور آرٹسٹ امل ٹھاکر نہیں تھا۔ اُس کی غیر حاضری سے میلا کا دل ٹوٹ گیا۔ دوسرے لوگوں کے جانے کے بعد وہ بھی جلدی ہی واپس چلی گئی۔ میرا سبج اسٹڈی روم اس کی بنائی ہوئی مورتیوں اور پینٹنگز سے سجا ہوا تھا لیکن ایک کربناک سناٹے میں بھی ڈوبا ہوا تھا میں اپنی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے کرسی میں ڈوبا ہوا سا خاموش بیٹھا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میلا کے لئے یہ سانحہ بہت بڑا ہے۔ بہت ہی تکلیف دہ۔ جس کا اب میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ اگر صرف ایک بار امل سے ملاقات ہو جاتی تو میں اُسے سمجھانے کی ضرور کوشش کرتا۔ اُس کی اس منطق کو ملط ثابت کر دکھاتا کہ ایک انٹلیکچول کے لیے کوئی صرف سیدھی سادی عورت ہی ہمیشہ بہتر ہو سکتی ہے دو ہم سطح آرٹسٹ بھی پورے سکوں سے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔ سوچا ایک دو روز میں خود اس کے پاس جاؤں گا

میں نے اپنے گلاس میں ایک آدھا اور ڈالا اور فرج میں سے برف نکال لائے

کے لئے اُٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک میں نے اُس کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا لیکن وہ سیدھا میرے پاس آنے کے بجائے سیلا کی سجائی ہوئی مورتیوں اور پینٹنگز کے درمیان ہی رُک گیا، اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنے کیمرے سے اُن کی تصاویر اتارتا پھرتا، یہ دیکھ کر میرے دل میں اُمید کی ایک ہی لَو جھلملائی اور میں نے اُسے ڈرنکس پر مدعو کر لیا۔ اُس نے انکار نہ کیا اور وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے پاس آ بیٹھا۔

چند روز پہلے میرے ایک سوانح نگار نے اپنا ٹائپ شدہ مسودہ نظرثانی کے لئے میرے پاس بھجوا دیا تھا۔ جو اسی وقت میز پر کھلا ہوا رکھا تھا۔ شاید میری ٹٹولتی ہوئی نظروں ہی سے بھانپنے کے لئے اُس نے اُٹھا کر مسودے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اُسے یہاں وہاں کئی مقامات پر دیکھ چکنے کے بعد اچانک وہ میری طرف سیدھے دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ بولا —— "آپ کی طرح میں بھی ایک آدمی ہوں۔ اس مرتبے تک پہنچنے کے لئے آپ نے جتنی جدوجہد کی ہے اُسے معلوم کر کے مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ کہ آپ کبھی صرف چار آنے روز پر اپرنٹس تھے۔ اور دو وقت کی روٹی کے لئے آپ کو اڑھائی آنے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ وہ زمانہ ضرور بہت ستا رہا ہوگا۔ لیکن میں آپ کی آتما کی اذیت سے انکار نہیں کر سکتا میں نے بھی آرٹ کالج میں آنے سے پہلے کئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی تھیں۔ بچوں کے ایک اسکول میں منیجر تھا۔ جس کی حیثیت ایک چپراسی کی تھی۔ ڈاک پوسٹ کرنا میڈم کے گھر سے اُس کا لنچ لے کر آنا، اسکول کی رکشاؤں کی مرمت وغیرہ کرانا پھر ایک لائبریری میں کیٹالاگر رہا۔ پھر ایک ڈراما گروپ میں پرامپٹر PROMPTER کا کام کیا۔ اسٹیج کے اندھیرے ونگ میں کھڑے ہو کر بعض نامعقول آرٹسٹوں کے لئے بھی بہت دھیمی آواز میں اسکرپٹ کے مطابق ڈائیلاگ پڑھا کرتا تھا جب مجھے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کلرکی مل گئی تو وہیں سے میرے دل میں کمرشیل آرٹسٹ بننے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اب میں اس حد تک مطمئن ہوں کہ میری دو تین نمائشیں بہت کامیاب رہی ہیں۔ بعض اچھے نقاد میرا ذکر بڑی محنت سے کرتے ہیں۔"

میں نے اُس کی باتوں کو بڑے غور سے سن کر جواب دیا۔ "تم نے میرے جس رتبے

کاد کرکیا ہے وہ مجھے محض دکھاوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا گلیمر جس کا میرے اندر کے حالیں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ شہرت کی ایسی علامت گردش ہے جس کی کوئی کھڑکی تک ایک تخلیق کار کی ذات پر نہیں کھلتی ہے۔ اگر تم میرے عام آدمی جیسی جد وجہد کے ساتھ ہی شناخت قائم کرنا چاہتے ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ میں ایک اچھی سمجھدار عورت کی قربت کے لئے ہمیشہ ترستا رہا ہوں۔ اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ جسمانی اور ذہنی ناآسودگی میں بہت فرق ہوتا ہے"

اس نے اٹھا کر خود ہی ہاتھ بڑھا کر اپنے لئے دوسرا گلاس بنایا اور کہا۔ "آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ لیکن میں اپنی آئیڈنٹٹی IDENTITY کو قربان نہیں کر سکتا۔ مجھے اسی کی حفاظت کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ میلا سرپواستو کی اپنی ایک الگ شخصیت بن رہی ہے۔ جو ہو سکتا ہے میرا راستہ کہیں روک دے یا اُس کے ساتھ میری ہم آہنگی ناممکن ہو جائے۔"

"لیکن وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ تمہارے بغیر وہ نہیں رہ سکتی۔"

"صرف مجھ ہی سے نہیں، آپ سے بھی وہ اسی شدت سے محبت کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بٹی ہوئی عورت ہے۔"

یہ سُن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اسے یہ کہئے گا، میں تو ایک ساٹھ سالہ بزرگ ہوں۔ اُس سے عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں آپ کی اس حیثیت کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ لیکن اس بات کو بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ آپ کو سارے رنگ برنگے پھول بہت اچھے لگتے ہیں، اور آپ کو قدرت کے ہر لطافے میں کوئی نہ کوئی خوبصورتی، کوئی نہ کوئی کشش ضرور نظر آجاتی ہے۔"

"تم کہیں حسد کا شکار تو نہیں ہو رہے ہو؟"

"بے شک ہو رہا ہوں۔ آئی ایم ساری۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ شاید اسے بھی آپ میری شکاریانہ کمزوری کا نام دینا چاہیں گے۔"

اچانک ہم دونوں نے ایک آہٹ سُن کر ایک ساتھ سر اُٹھایا۔ میلا ایک بہت بڑے مجمعے کے ساتھ ٹھوکر کھانے کے بعد ہماری طرف چلی آرہی تھی۔ وہ ہمارے پاس

ہٹ کر میری میز کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ کچھ لمحوں تک ایک خالی گلاس کو میز پر ادھر اُدھر گھماتی رہی۔ پھر اس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیل کر اطمینان سے بولی۔

"میں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو بالکل بھلا دیا تھا کیونکہ تم ہی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو وہ سب سے بڑے خالق کی ایک منشا ہی پوری کرتے ہیں۔ یاد ہے، تم نے ایک اور بھی بڑا انٹلیکچوئل قسم کا جملہ کہا تھا جو یقیناً تم نے کسی اور سے سنا ہوگا یا کسی کتاب میں پڑھ لیا ہوگا ــــ 'ہم ایک دوسرے سے مل کر ہی اپنے خدا کی طرف بڑھتے ہیں۔ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میرے پیٹ میں تمہارا بچہ پل رہا ہے جو پیدا ہوتے ہی اُسی خدا کی جستجو میں لگ جائے گا جس میں ہم دونوں ناکام رہے ہیں لیکن تم اُس کی فکر بالکل مت کرو۔ میں اُسے اپنے پاس رکھ کر تمہاری ذات کی یہاں پرچھائیں نہیں پڑنے دوں گی۔ وہ میری اپنی شخصیت کا ہی حصہ بنے گا۔ اور میں ایسا کر سکتی ہوں۔ کیونکہ میرے اندر اعتماد پیدا ہو چکا ہے کہ اب میں کسی کے سامنے اس طرح ہتھیار نہیں ڈالوں گی جس طرح تمہارے آگے ڈال دیئے تھے۔ رہی بات ان کی؟"

میلا نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا جس میں چاہت بھی تھی، اور بیگانگی بھی اور ایک حد تک تکلیف دہ صبر بھی جو اُن لمحوں میں واقعی اُس کی اندرونی قوت کا غماز بن گیا تھا۔ وہ بولی "اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ماما کی شفیق مسکراہٹ نے حد بیزار کر دیا ہے تو تمہیں کیوں جلن محسوس ہوتی ہے؟ میں تو یہاں آتی رہوں گی۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔"

⁂

بے آرزو لمحوں کا حساب

مجھے یقین نہ آسکا کہ کوئی عورت شادی کے دو ہی سال بعد اپنے شوہر سے اتنی جلد بیزار ہو سکتی ہے، خاص کر وہ، جس نے اپنی پسند سے شادی کی ہو اور اس میں اپنے والدین کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔ مجھے وہ دن ابھی تک یاد تھا جب اسمارے مجھے فون پر اطلاع دی تھی۔ "آج شام کو کارلٹن کے روم نمبر ۲۹ میں میری شادی ہوگی آپ کی شرکت بے حد ضروری ہے"
میں جب وہاں ایک چھوٹا سا تحفہ لے کر پہنچا تو ہوٹل کے ریسپشن کو بڑا پر اسما اور اس کا ہونے والا شوہر صاحب موجود تھے۔ ابھی اس نے صاحب سے میرا تعارف کرایا ہی تھا کہ دو آدمی ایک مولوی صاحب کو لے کر آگئے۔ جب ہم کمرے میں پہنچے تو فوراً ہی نکاح پڑھا دیا گیا تھا پھر مولوی صاحب کو اسی کار میں بٹھا کر رخصت کر دیا گیا جس میں انھیں لے آیا گیا تھا۔ بات کے ڈسر پر ہم پانچ لوگ تھے اسما اور اس کے شوہر کے علاوہ اسما ہی کے تین دوست۔ کبھی کبھی یہ حالت اس ادارے سے بھی تو ڈی جاتی ہے کہ بنا کسی چہل پہل، دھوم دھڑکے اور مہندی کی حنا رکوں اور ہار سنگار کے، ایک دوسرے کو پسند کرنے والے دو لوگ — عورت اور مرد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو عجیب سا لگتا ہے۔ اس کے بعد زندگی معمول پر آجاتی ہے۔ چھوٹا سا گھر، گھر داری چلانے کے لیے تنخواہوں کا بجٹ اور مسائل اور جان پہچان کے، دور و نزدیک کے لوگوں کے یہاں

آنا جانا اور قہقہے!

میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ گاڑی اپنی پٹڑی پر ٹھیک ٹھیک چلی جا رہی ہے لیکن اس روز اُس نے اچانک یہ کہہ کر — "میں بہت زیادہ خوش نہیں ہوں، کئی ہفتوں سے پھر اپنے میکے میں رہ رہی ہوں اور شاید کبھی واپس ہی نہ جاؤں"۔ مجھے حیران کر دیا پھر جب اس نے ایک طویل، اکتا دینے والی گھریلو کہانی شروع کر دی تو میں بیچ میں ہی کہیں ساری دلچسپی کھو بیٹھا شاید میں اس کو میں ذہنی طور پر ایک غیر ذمہ دار شوہر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے جب اس نے میرے رویے میں کچھ سرد مہری دیکھی تو وہ اچانک چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک صدمے کے آثار بھی نظر آئے۔

"معاف کرنا اسما۔ میرے دل و دماغ میں اس وقت جائیکہ پوری کی فراخ واضح سڑکیں گھوم رہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے ایک گھنٹے بعد انگلینڈ کے سفارت خانے میں پہنچنا ہے انہوں نے ویزا لگانے کے لیے ٹھیک چار بجے بلایا ہے۔ جبکہ یہی وقت جرمن سفارت خانے میں بھی جانے کا طے ہو چکا تھا وہاں اب کل ہی جا پاؤں گا — اور فرانس والوں نے تو ابھی تک کوئی قطعی اطلاع ہی نہیں دی ہے۔ اسی سے تم اندازہ کر سکتی ہو کہ میں کتنا فکر مند ہوں، لیکن ہٹاؤ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا اس وقت میری تجویز یہ ہے کہ کیوں نہ کچھ بہت ہی لذیذ چیزیں کھانے پینے کی منگا لی جائیں، تاکہ ہم دونوں اپنی اپنی پریشانی کچھ دیر کے لیے بھول جائیں"

ہم پارلیمنٹ اسٹریٹ کے ایک "بیس منٹ" (BASEMENT) ریستوران میں کئی لوگوں سے بھری ہوئی میزوں کے درمیان بیٹھے تھے اسما اچانک اپنی رائے پر قابو پا کر ہنس پڑی۔ بولی — "ایک طرح سے یہ تو آپ نے تسلیم کر ہی لیا کہ میری بھی کوئی پریشانی ہے! لیکن اب پھر اس کا ذکر نہیں کروں گی کیونکہ آپ کو سنا اچھا نہیں لگتا، لیکن ایک درخواست ضرور کروں گی، کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ باہر چلی جاؤں؟ کچھ اخراجات میں خود برداشت کر سکوں گی۔ اس سے مجھے اپنے تکلیف دہ ماحول سے کچھ عرصے کے لیے دور ہو جانے کا موقعہ مل جائے گا"

اُس کی یہ تجویز سُن کر میں چونک گیا پچیس سال کی دُبلی پتلی اور اُونچے قد کی بے حد دلکش عورت کی آنکھوں میں کئی لمحوں تک بڑی خاموشی سے جھانکتا رہا، جو بے چینی اور احتجاج کی

لی مُلی کیفیت سے سرشار تھیں

میں نے حواس دیا۔" کیا اسے تمہارے حالات سے ایک فرار نہیں کہا جائے گا؟ تمہارے سیلف کینفی ڈینس (SELF CONFIDENCE) کا کیا ہوگا جو تمہاری سب سے بڑی دولت ہے؟"

"اوہ! ہیل ود مائی سیلف کینفی ڈینس! (OH! HELL WITH SELF CONFIDENCE) آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میں اندر سے کس قدر ٹوٹ چکی ہوں اس آدمی نے میری ساری پرسنالٹی (PERSONALITY) ہی مجروح کر دی ہے!"

حسن موضوع سے میں بچنا چاہتا تھا اسی پر پھر گفتگو چھڑ گئی تھی۔ لیکن اسی وقت صدی کا مشہور کہانی کار ہیثم ساہنی وہاں آ گیا میں نے اُسے "ہیلو" کہا تو وہ ہماری ہی میز پر آ گیا۔ اُس کے ساتھ کوئی یورپی لڑکی بھی تھی جو کبھی دروازے پر رکی ہوئی تھی اُسے بھی ہیثم نے وہیں بلا لیا اور مجھ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔" یہ آستری ستوال ہے مشرقی جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں ہندی پڑھاتی ہے۔"

میں نے ان دونوں سے اسماء کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔" اسماء اساب ہیں۔ انگریزی لٹریچر سے ایم اے کیا تھا۔ کچھ مدت جنرل انشورنس میں بھی سروس کی لیکن اُن کا خاص مشغلہ تو تین لیڈنگ ویکلیز (LEADING WEEKLIES) کے لیے ادبی موضوعات پر کالم لکھنا رہا ہے۔ ان کے منتخب کالموں کی ایک کتاب بھی شائع ہو رہی ہے۔"

"آپ نے تو میری ایک کتاب پر ریویو بھی کیا تھا!" ہیثم نے خوش ہو کر کہا۔ اور اُس کے ساتھ ہاتھ ملا کر بولا" آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

میں نے اسماء کے چہرے پر مسرت اور فخر کی ایک جیرتناک چمک اُبھرتے ہوئے دیکھی وہ اپنے لوائے کٹ بالوں، لمبی گردن اور جسم کے اوپر ایک خوبصورت گلے کھلے ٹاپ کے ساتھ اتنی دلکش معلوم ہو رہی تھی کہ اس کے سامنے آستری کی شخصیت ایک عام سی یورپی لڑکی جیسی ہو کر رہ گئی لیکن اردگرد کے کئی لوگ ابھی تک گردنیں گھما گھما کر اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے اُس سے پوچھا۔" تم نے یہاں کی کچھ یونیورسٹیوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا جہاں

ہندی پڑھائی جاتی ہے ؟"

"میں یہاں دراصل اپنی ریسرچ کے سلسلے میں آئی ہوں۔ ہندی زبان کی نئی لفظیات پر کام کرنے کے لیے اس زبان میں دوسری ہندوستانی زبانوں خاص طور پر اُردو کے بیشمار الفاظ شامل ہوچکے ہیں۔"

"آپ جیسی ماہر کی لڑکی کے لیے تو یہ کام خاصا مشکل ہوگا۔ آپ کو آزادی سے پہلے کی شدھ ہندی میں لکھا ہوا سارا لٹریچر پڑھنا پڑے گا۔ اس کے بعد نئے الفاظ کی لسانی و سماجی جڑوں کا پتہ بھی لگانا ہوگا۔"

وہ کافی پیتے ہوئے بولی "جی ہاں۔ یہ مشکل تو لگتا ہے لیکن میں نے اسی مشکل کو دوسروں کے لیے آسان کرنے کا ہی تو بیڑا اُٹھایا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ اس کے ہنسنے میں ہم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ پھر اچانک میں نسیم ساجی سے مخاطب ہوگیا۔ "میں اگلے ہفتے یورپ کے کئی ممالک کی سیاحت پر جا رہا ہوں۔ میری ملاقات انگلینڈ سے ہوکر ہے۔ کیا آپ کی وساطت سے مجھے وہاں کا ویزا مل جائے گا؟ آپ تو ہماری پی ڈبلیو اے (P W A) کے جنرل سکریٹری ہیں۔"

نسیم کچھ لمحوں کے لیے ایک سوچ میں ڈوبا سا رہ گیا۔ پھر بولا "اس کام کے لیے اگر آپ ڈاکٹر محمد حسن یا ڈاکٹر قمر رئیس کے رسوخ کو استعمال کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

میرے اندر اچانک غصہ پیدا ہوگیا۔ "میں کسی سے بھی نہیں کہوں گا۔ مجھے اپنی تحریروں پر پورا بھروسہ ہے۔ آج نہیں تو کل وہ خود دعوت نامہ بھجوائیں گے۔ نہیں بھی بھجوائیں گے تو میرے اندر کون سی کمی آ جائے گی۔"

جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو اسمارے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ——
"آج معلوم ہوگیا کہ میرے اور آپ کے اندر کم از کم ایک چیز تو مشترک ہے۔"

"وہ کون سی ؟"

"غصہ! احتجاج! اگرچہ ہم دونوں الگ الگ حالات کی پیداوار ہیں۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

جب میں یورپ کی سیاحت کے دوران جنیوا میں مقیم تھا تو ایک روز مجھے سمارا کا ایک طویل خط
ملا۔ اس نے میرے خط کے جواب میں جو میں نے دونوں کی صلح کرانے کے لیے اُسے لکھا تھا،
بڑی وضاحت سے تحریر کیا تھا۔ "سمارا کے اور میرے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی ہے، اس کا
ذمہ دار اس کا محکمہ جنگلات کا افسر باپ ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو شروع ہی سے اتنی آزادی دے
رکھی تھی کہ سمارا نے اپنی تعلیم کے سلسلے میں بھی اس سے کسی مشورہ نہیں لیا۔ اس نے اپنی مرضی سے
ہی اسٹوڈنس کی ملازمت کر لی تھی۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ آزادی کے مفہوم میں کتنی آگے
بڑھ گئی تھی۔ ہماری شادی ایک اتفاقیہ امر تھا۔ اس سے میں انکار نہیں کرتا کہ میں نے ہی اُس سے
محبت جتانے میں پہل کی تھی لیکن نکاح کے موقع پر اپنے اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کو شریک نہ
کرنے کا فیصلہ صرف اُسی کا تھا۔ اُس کا یقین ایک قسم کے اڈونچر (ADVENTURE) میں تھا
جس سے وہ سب کو ایک حیرت میں مبتلا کر دینا چاہتی تھی۔ اس کی محبت سے مجبور ہو کر میں نے
بھی اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے، جس کے بعد مجھے اپنے خاندان اور دوسرے لوگوں کے
سامنے کافی ندامت اُٹھانی پڑی۔ میں نے اس کی سروس اس لیے چھڑوا دی تھی کہ میرے یہاں روپے
پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں خود اس قدر کما لیتا تھا کہ اسے وہ دل کھول کر خرچ کر سکتی تھی۔
اس نے میرے عزیزوں اور دوستوں کی خاطرداری میں بھی بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔ اُن کے ساتھ
اُن کی عورتیں بھی ہم لوگوں سے ملنے آتی تھیں تو وہ اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ میرے
ہمراہ کسی کی تقریب میں شریک ہونا تو دور کی بات رہی بلکہ وہ اچانک اپنے باپ کے گھر چلی گئی
میں اس سے ملنے کے لیے جاتا تو وہ کبھی سامنے نہ آتی۔ میں نے کئی بار اس کے والد کے
سامنے اپنی شکایات رکھنے کی کوشش کی لیکن اس نے بھی میری ایک نہ سنی۔ اِدھر اُدھر کی
باتیں چھیڑ کر مجھے ہمیشہ ٹرخا دیا۔ آپ یہاں ہوتے تو میں آپ کو بھی وہاں اپنے ساتھ لے کر جاتا۔ اب
میں نے اپنی ایک ساتھی وکیل کی معرفت سمارا سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی جا کر اُس سے
مل آتی ہے لیکن صلح صفائی کی ابھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب اگر وہ اپنی سروس دوبارہ
شروع کرنا چاہتی ہے تو میں اس پر بھی اعتراض نہیں کروں گا۔ آپ چاہیں تو یہ بات سمارا کو
لکھ سکتے ہیں"

ساف کا خط پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اُس نے اپنے رویہ میں خاصی تبدیلی کر لی تھی۔ اُس کے اس بیان میں مجھے اُمید کی کرن دکھائی دی اور تصور ہی تصور میں اسمار کو لکھنؤ کی سڑکوں پر پہلے کی طرح اسکوٹر پر آتے جاتے دیکھ لیا۔ اب وہ پھر سے آرٹ کی نمائشوں، ادبی جلسوں اور شہر والوں میں پوری آزادی سے گھوم رہی تھی کافی ہاؤس اور دوسرے ریستورانوں میں اپنے حلقے کے لوگوں کے درمیان میٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی میں اُسے گذشتہ دس سال سے بہت قریب سے جانتا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی اسکینڈل نہیں مشہور ہوا تھا۔ اُس کی شخصیت اتنی باوقار اور اس کا رویہ اتنا محتاط اور خوشگوار رہتا کہ آج تک کسی نے بھی اُس سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی ساف کے ذہن سے اگر یہ خدشات دور ہو جاتے ہیں۔ تو دونوں پھر سے اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔

جس روز میں ہندوستان واپس آیا، ایئرپورٹ پر میری بیوی اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ اسما بھی موجود تھی اس نے کہا۔ "میں خاص طور پر آپ کو ریسیو کرنے کے لیے لکھنؤ سے آئی ہوں۔"

واپسی کے سفر میں بھی وہ ہمارے ساتھ تھی اسی دوران اُس نے کچھ نئے انکشاف کیے ساف نے مجھے طلاق دیدی ہے۔ میرا بچہ اب اس کے پاس ہے اُس پر میرا کوئی حق ہے جب تک وہ بڑا نہیں ہو جاتا۔ اس نے دوسری شادی بھی کر لی ہے۔ اسی وکیل دوست آسمہ کے ساتھ جو ہمارے درمیان صلح کرانے کا ڈراما کر رہی تھی اُس کی ساری حرکتیں ساف کو مجھ سے اور بھی دُور کرنے کے لیے تھیں، جس میں بالآخر وہ کامیاب ہو گئی اب میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ عدالتی کارروائی کے بغیر مجھے میرا بچہ مل جائے۔ میں اس کی پرورش کے لیے کوئی الاؤنس بھی نہیں چاہتی۔"

لکھنؤ پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ساف اور اس کی بیگم کو اپنے گھر مدعو کر لیا انہیں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو بھی ساتھ لے کر آئیں کہ جسے میں نے ابھی تک دیکھا نہیں تھا اس موقع پر اسمار کو بھی بلا رکھا تھا۔ میری بیوی نے سب کو چھوٹے چھوٹے تحفے پیش کر کے ماحول کو خاصا خوشگوار بنا دیا تھا اگرچہ ساف اور آسیہ پہلے ہی یہاں خاصا خوشگوار موڈ لے کر آئے تھے آسیہ اتنی خوش شکل تو ہرگز نہیں تھی کہ اُس کا مقابلہ اسمار سے کیا جا سکتا لیکن وہ بات چیت میں بہت ہی دلچسپ اور بے تکلف تھی جو سماں نے خود ایک جشن سی لگی تھی۔ ان دونوں نے اسمار کو بھی، "ہائے دیکھو

پاک کھول ہنس چڑھائی تھی ملکہ اس کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آئے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن اسماء کی تمام تر توجہ اپنے بچے عدنان پر مرکوز رہی اُسے اس نے کئی ماہ بعد دیکھا تھا۔ وہ بار بار اُسے اپنی گود میں لے لینے کی کوشش کرتی تھی لیکن عدنان مچل کر اُس کی گرفت سے نکل جاتا اور آسیہ کے پاس بھاگ جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر اسماء کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ اُس کے اس طرح رو پڑنے سے سارا ماحول ایک دم اُداس ہو گیا اس بات کو مصاف اور آسیہ نے بھی محسوس کیا' لیکن وہ کر ہی کیا کر سکتے تھے وہاں صرف عدنان ہی تھا جو سب کی طرف بڑی حیرت سے' بڑی معصومیت سے دیکھ رہا تھا اسماء کو روتے دیکھ کر تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا لیکن اُس کی ہنسی کسی کے بھی چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکی۔

جب اسماء نے کافی دیر تک اپنے چہرے پر سے ہاتھ نہ ہٹائے تو عدنان سہمے سہمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ اُٹھا کر اسماء کی طرف بڑھا لیئے اور آنکھوں میں شرارت بھر کر بولا ـــــ "تا"

اسماء نے اس کی آواز سن کر آنکھوں سے ہاتھ اٹھا لیے ہم سب حیران ہوئے ماں بیٹے کی حرکت دیکھ رہے تھے اسماء نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ پھر بھاگ کر چیختا ہوا آسیہ کی گود میں چلا گیا۔ لیکن آسیہ نے اُٹھا کر بچے کو اُس کی گود میں زبردستی ڈال دیا اور کہا ـــ "اسے اپنے پاس ہی رکھیے۔ بیا ہے جتنا جیتے چلاتے ہم لوگ جا رہے ہیں؟"

مصاف اور آسیہ باہر چلے گئے۔ بچہ بے طرح روئے جا رہا تھا جیسے اُس سے اُس کی ماں چھین لی گئی ہو اسماء نے میری طرف بڑی بے بسی سے دیکھا اس کی آنکھوں میں نہیں تم رہا تھا کیا کرے! آخر اُس نے عدنان کو میری گود میں دیتے ہوئے کہا "اسے لے جا کر آپی کو دیدیجیے اب اس کے ساتھ میرا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں اس کی ماں نہیں بن سکتی؟" اور روتے روتے مری بیوی کے گلے سے لپٹ گئی۔

٭ ٭ ٭

متیبوں کے ذریعے تواکیلا
ئی اور سوئی کا کام کرتے
، دکانوں پر پہنچ کر
ر ساشے کمارہی تھی
ر کبھی واپس کرے
عبدالاحد
ں سے
میں

تمام رات جلائے بجھا بجھا کے چراغ

آزادی کے ساتھ جو فسادات پھوٹ پڑے تھے اُن کے اثرات ۱۹۶۰ء تک آتے آتے تو
قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اُن کی تکلیف دہ یادیں ابھی تک ذہن سے مکمل طور پر محو نہیں ہوئی
تھیں میں اپنے ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں کبھی اِدھر اُدھر ہوتا کبھی سیکڑوں میل دور گجرات میں
گراں مہاراشٹر، پنجاب، بہار ریاستوں کے کئی بڑے بڑے شہر اور قصبے اور گاؤں اسی سلسلے میں دیکھ
لیے تھے ایک روز علی گڑھ کے ویٹنگ روم میں میری ملاقات سہیل صاحب احسان کی اور شمیم خوش رو
خوبی سے ہو گئی

میں چائے، ناشتے سے فراغت پا کر مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جانے کی تیاری میں مصروف
تھا پروگرام یہ تھا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار سے مل کر شہر چلا جاؤں گا جہاں مجھے کئی سرکاری
کاموں سے نپٹنا تھا چونکہ ویٹنگ روم میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اس لیے وہ دونوں
میری طرف خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے میری بھی وہی کیفیت تھی کہ آدمی کبھی کبھی خاموش لمحے کی
مسحور گرفت میں اچانک سمٹ جاتا ہے۔ میں بھی اُن سے مخاطب ہوئے بغیر نہ رہ سکا اُن کے ساتھ اپنا
تعارف کرا کے چائے کو بھی آرڈر دے دیا
اتنا تو مجھے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئے تھے کیونکہ ان کے پاس سامان

ے تھے ہمارا مکان رسٹ روڈ پر تھا"

م سنتے ہی میرے ذہن میں جیسے ایک کوندا سا لپک گیا جس نے اسی ایک
ہجوم عام سے ایک لگتے والی ایک لمبی لڑکی کا سراپا بھی اختیار کرلیا ۱۹۸۱ء کی
ماش میں جو اسمبلی ہاؤس جانے والی سڑک کے ایک وسیع میدان میں لگائی گئی تھی اپنے
ں کے ساتھ گھومتے گھومتے اچانک ایک چہرہ میری نظروں میں بے اختیار سما گیا تھا تب میری عمر
اٹھارہ سال تھی، میرے ساتھ عطاء اللہ، عبدالاحد جان اور اس کی نئی نویلی بیوی سیما بھی تھی سیما اور
عبدالاحد یال سینچ کالج کے اسٹوڈنٹ تھے ان کا عشق وہیں سے شروع ہوا تھا عبدالاحد نے
جیسے ہی لوکوورکشاپ کی اپرنٹس شپ ختم کی، انھوں نے اپنے اپنے والدین کو اطلاع دیئے بغیر شادی
کرلی تھی وہ دونوں ہی میرے ساتھ جانے کے مکلف تھے عطاء اللہ تو میرے ساتھ ہی رہتا تھا
میں نے انھیں اس لڑکی کے بارے میں یہ بتانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ جس لڑکی کی محبت
میں مجھے اب واقعی گرفتار ہونا چاہیے وہ اسی نمائش میں اپنی ماں کے ساتھ گھوم رہی ہے اس پر
سیما جان نے سب سے پہلے قہقہہ لگایا تھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا "چلیے بھائی جان، مجھے بھی ایک نظر

دہ لڑکی دکھا دیجیے اس کے بعد میں اپنی رائے دوں گی۔"

چھوٹے بڑے اسٹالوں کی کئی قطاروں کے چکر لگاتے جہاں مشینوں کے ذریعے جوا کھیلا
جا رہا تھا وہیں ایک ٹینٹ کے اندر ایک آدھے دھڑ کی عورت کو سلائی سائی اور سوئی کا کام کرتے
ہوئے دکھایا جا رہا تھا اس لڑکی کو تلاش کرنے میں کامیابی نہیں چاٹ والی دکانوں پر پہنچ کر
نصیب ہوئی، جہاں وہ اپنی ماں اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ کھڑی پانی والے تاشے کھا رہی تھی
اس مرچ مصالحے دار پانی پی لینے سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوا اٹھا تھا۔ ہم نے بھی وہیں کھڑے
ہو کر چاٹ کا آرڈر دے دیا اتنے میں ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے عطاء اللہ اور عبدالاحد
بھی آگئے میں نے انہیں بھی اشارہ کر کے وہ لڑکی دکھائی تو سب اس کی طرف تعریفی نظروں سے
دیکھنے لگے شاید یہ میری مسرت کے بہترین لمحے تھے کہ انھوں نے میری پسند پر ناک بھوں نہیں
چڑھائی تھی اس سے پہلے کئی بار ایسا ہو چکا تھا جب کبھی میں نے کسی لڑکی کا ذکر اُن کے سامنے کیا تو
انھوں نے مل کر ہمیشہ میرا مذاق ہی اڑایا تھا میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج اس لڑکی کے پیچھے
پیچھے جا کر اس کے گھر کا پتہ لگا کر لوٹوں گا۔

جب وہ نمائش گاہ سے نکلیں تو ہم تینوں ایک فاصلے سے اُن کا تعاقب کر رہے تھے ـــــ
کلوز روڈ سے نسبت روڈ تک ہم ان پر نظریں جمائے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے رہے اگرچہ ہمارے اور ان کے درمیان
کئی تانگے اور موٹریں آئیں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ نے بھی دیوار بن جانا چاہا لیکن وہ لڑکی میری تیسر[ی]
[…]عالی نظروں سے یکسر اوجھل نہ ہو سکی۔ لیکن ایک موڑ پر جب وہ ایک گلی میں چلی گئی تو ہم سمجھے کہ گلی جا[…]
[…]لی ہوگی اور ہم لپک کر ابھی وہاں جا پہنچیں گے اور جس گھر میں وہ داخل ہوگی، اس کو آئندہ ہمیشہ
یاد رکھیں گے لیکن ہمارے موڑ پر پہنچتے پہنچتے وہ غائب ہو چکی تھی خدا جانے اس کا گھر کونسا تھا اس
کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا

ملہ صاحب اور اُن کی بیوی کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا
کہ ہو نہ ہو یہ اسی لڑکی کے ماں باپ ہیں جو اس عرصے میں اس لڑکی کے خدوخال تک میرے
ذہن سے محو ہو چکے تھے، بس اس کا ایک دلکش سراپا تھا جسے میں ابھی تک نہیں بھول پایا تھا۔
چند منٹوں کی رفاقت میں جو چلنے کے دورے شروع ہوئی تھی ملہ صاحب بھی میرے

ساتھ گفتگو کرنے لگے تھے انھوں نے میرے پیشے اور گھر کے بارے میں دریافت کیا تھا اور اپنے بارے میں بتایا تھا کہ علی گڑھ میں اُن کی تالوں کی چھوٹی سی فیکٹری تھی جس کے ایک حصّے میں ان کی رہائش بھی تھی جس وقت کالکا میل پلیٹ فارم پر آ کر رکی میں بھی ان کے ساتھ تھا فرسٹ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں سے اُن کی بیٹی دو خوب گورے چٹے بچوں اور بہت سے سامان کے ساتھ اُتری اور کچھ وقت کے لیے بھلّہ صاحب اور ان کی بیوی مجھے بالکل بھول گئے

میں خود بھی اپنے آپ کو بھلا چکا تھا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے جیسا سوچا تھا ہو بہو ویسا ہی ہو گیا تھا قریباً بیس برس پہلے دیکھا ہوا ہر ایک چہرہ ویسے کا ویسا نہیں رہتا ہے بیشتر چہرے بے حد بدل جاتے ہیں زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں یا مُرجھا جاتے ہیں، یا اپنی رنگت و تمازت بھی کھو بیٹھتے ہیں میرا یقین معمولوں میں ہرگز نہیں ہے لیکن جو حیرتناک واقعہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس پر یقین بھی نہیں ہو رہا تھا انہیں لمحوں میں آدمی بار بار اپنی آنکھیں مل کر دیکھتا ہے اور بڑی حیرت سے پوچھتا ہے یہ کوئی خواب تو نہیں ہے!

یہ وہی لڑکی تھی جو اب ایک دلکش عورت میں تبدیل ہو چکی تھی ویسے ہی لمبے بال جو اب یا تو مجھے اور زیادہ چمکیلے ہو چکے تھے، ماں باپ سے مل کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں لیکن وہ بچوں اور سامان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی اس نے مجھے بیس برس پہلے بھی نہیں دیکھا تھا اور اب بھی وہ میرے وجود سے بالکل بے خبر اور لاتعلق تھی یہ صرف میں تھا جو اس کے بارے میں جانتا تھا اور ایک عجیب سی رومانی کشمکش میں مبتلا تھا مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے بعد شاید ہی اُسے پھر کبھی دیکھ سکوں گا مجھے وہاں اب اور دیر تک کھڑے رہنا بھی کسی طرح مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے ایک طرف جاتے ہوئے بھلّہ صاحب اور اُن کی بیوی کی طرف ہاتھ لہرا کر جانے کی اجازت چاہی تو انھیں جیسے میری یاد اچانک آ گئی بھلّہ صاحب آگے بڑھ کر بولے ــــ "اچھا یہاں کب تک رہیں گے۔ موقعہ ملے تو ہمارے یہاں آئیے یہ میرا کارڈ ہے جب جی چاہے چلے آئیے گا آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہماری بیٹی دس سال کے بعد آئی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم بھول گئے تھے سوری ــــ اس سے ملیئے۔"

علی گڑھ میں میرا قیام بہت مختصر تھا صرف دو دن کا لیکن میں نے اسے ایک روز کے لیے

ڈھالیا اور حسن روز مجھے واپس جانا تھا اس دن شام کو بھلہ صاحب کے گھر پہنچا اس میں میری سراسر خودغرضی کو دخل تھا خودغرضی اور کمینگی کو بھی میں اُن کی بیٹی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا حسن کا نام تک مجھے نہیں معلوم تھا

میں نے بھلہ صاحب کی کوٹھی "ماناں" میں پہنچ کر کال بیل بجائی توحلاف توقع اس کی اسی بیٹی نے دروازہ کھولا دروازہ قد آگردن کے دونوں طرف ریشمی بال، ہلکے پیلے رنگ کی شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس یہ دیکھ کر کھولا ہوا صدمہ پھر تازہ ہوگیا کہ اس نے اب بھی مجھے نہیں پہچانا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے چند لمحوں تک بالکل خاموش کھڑے رہ گئے۔ پھر اچانک اندر سے اس کی ماں نے پکار کر پوچھا

"کون ہے، توشی!"

یہ سن کر اس نے گھبرا کر پہلے تو پلٹ کر دیکھا ادھر سے اُس کی ماں کی آواز آئی تھی۔ پھر اُس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا جواب دے میں اُسے اپنا نام بتانے ہی والا تھا کہ اس کی ماں بھی وہاں آپہنچی ہاتھوں میں ایک سوئیٹر اور سلائیاں لیے ہوتے۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولی" اچھا آپ ہیں، آئیے آئیے"

لیکن میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی ماں بیٹی کے درمیان جو ڈائیلاگ ہوا وہ کچھ اس طرح تھا

"ممی! آپ سے کتنی بار کہا ہے مجھے توشی کہہ کر نہ بلایا کرو"

"مجھ سے نہیں پکارا جاتا ہر وقت ناہید، ناہید، کیا کروں دل ہی نہیں مانتا"

"نہیں مانتا دل تو پھر مجھے بھی یہاں مت بلایا کرو میں وہیں اچھی ہوں جہاں رہتی ہوں میری پرانی شناخت تو عرصہ ہوا ختم ہو چکی۔ پچ پچ میں بھول بھی گئی ہوں کہ کبھی میرا نام ناہید کے علاوہ بھی کوئی تھا"

پھر جیسے اچانک انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا اور دونوں چپ ہو گئیں مسز بھلہ کے چہرے پر ندامت بھی دکھائی دی اور وہ جلدی سے اندر چلی گئیں ناہید وہیں کھڑی رہی وہ خاموش تھی لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار نہ تھے

لیکن ایسا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے اندر اپنی ماں کے ساتھ ہوئی گفتگو کا رد عمل ابھی تک موجود ہے
اچانک وہ پلٹ کر میرے پاس آ بیٹھی لیکن دوبارہ ملنے پر اداس جیسے اس نے اپنے اوپر قابو
پالیا تھا ہنس کر بولی" معاف کیجیے گا میں اپنی ممی پر ایک خاص بات کے لیے خفا ہو رہی تھی میں
پاکستان سے آئی ہوں دبئی رہتی ہوں۔ میرا نام ماہید ہے ماہید جمال میری دبئی میں شادی ہوئی
ہے۔ اب تو عرصہ ہو گیا۔ جب پاکستان یاد آیا تھا لیکن ممی ابھی تک مجھے کوستی ہی رہتی ہیں۔ یعنی
جب میں متوحش ہوتی تھی لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی اپنے ماضی کے ساتھ ہمیشہ رہ سکتا ہو۔
کم سے کم میں تو ہرگز نہیں رہ سکتی۔ ان کی بات اور ہے، بوڑھے ہو گئے ہیں ناں جذباتی بھی ہیں
ہیں تو ٹھیک بھی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن میں ان کی کیوں تقلید کروں؟
میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں اس طرح بالکل نہیں سوچ سکتی یہ میری اپنی مجبوری یا کمزوری کچھ
بھی کہہ لیجیے۔ ہو سکتی ہے۔"

مسز جمال نے اچانک دروازے کے سامنے نمودار ہو کر بتایا ــــ "میں نے انہیں فون
کر دیا ہے کہتے ہیں ابھی آپ کو جانے نہ دوں آپ بیٹھیے چائے بھجواتی ہوں" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں نے ماہید سے پوچھا "آپ نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا میں کون ہوں!"

"اوہ! سوری مجھ سے واقعی بھول ہوئی لیکن، شاید آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے،
اس سے پہلے"

میں نے اسے بتایا ــــ "صرف دو روز پہلے اسٹیشن پر جب آپ گاڑی سے اتری تھیں۔
میں بھی آپ کے ممی ڈیڈی کے ساتھ وہاں موجود تھا"

"اچھا۔ لیکن ــــ"

"لیکن اس سے بھی کئی برس پہلے غالباً بیس برس پہلے صرف میں نے آپ کو دیکھا تھا آپ
نے مجھے ہرگز نہیں یا ممکن ہے آپ نے بھی مجھے اس لیے دیکھا ہو کہ میں آپ کی طرف متوجہ تھا
لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی بیس برس پرانی بات کو کیسے یاد رکھے گا؟"

اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں اچانک بے پناہ حیرانی بھر گئی "میں سمجھی نہیں کیا
مطلب ہے آپ سے میری ملاقات بیس برس پہلے واقعی ہوئی تھی! ہائے ربا! یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ میں اس ملاقات کو یکسر بھول گئی۔

"نہیں ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ دراصل وہ ایک بہت ہی عجیب واقعہ ہے بلکہ بہت ہی
احمقانہ اور بچکانہ قسم کا۔ اٹھارہ سال کی عمر کا آدمی یا تو بچہ ہوتا ہے یا پھر بالکل ہی احمق۔ میں اسی قسم کی کوئی
چیز تھا جیرٹ بائے"

یہ کہہ کر میں رو دیے ہنس پڑا ہنستے ہنستے میرے آنسو بھی نکل پڑے وہ میری طرف بڑے
غور سے دیکھتی رہی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے پوچھا

"آپ کے میاں وہاں کیا کرتے ہیں؟ کس شہر میں رہتے ہیں آپ لوگ؟"

"معمولی تھوڑا سا کاروبار کر لیتا ہے باقی وقت جھک مارتا ہے یعنی وہ منشیری کا بزنس تو
کرتا ہے لیکن بہت ہی بے دلی سے پھر بھی اتنا خوش قسمت واقع ہوا ہے کہ تھوڑی سی محنت سے بھی اچھے
کافی آمدنی ہو جاتی ہے اس کی ایک ہابی ادھر ہے جسے میں نے جھک مارنے کا نام دیا تھا وہ پاکستانی
کاریگروں کو عرب ممالک میں ملازمت دلانے میں بڑا ماہر ہے اسی سلسلے اکثر باہر گھومنے نکل جاتا
ہے پچھلے ہفتے وہ ترپولی روانہ ہوا اور میں اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے یہاں چلی آئی؛
میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ جلدی سے اندر جاتے ہوتے بولی۔ "چائے تیار ہو گئی ہے
ابھی آتی ہوں لے کر"

میں نے اس کے بیس برس پہلے کے امیج کو یاد کیا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی بچھی ہوئی
تھی وہ اپنی ماں اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ ایک تنہا سہ اور پُروقار خاموشی سے گھومتی رہی تھی۔
اس کی اس ادا نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور اب وہ کسی قدر باتونی ہو رہی تھی لیکن اس سے مجھے
کسی قسم کا جذباتی صدمہ محسوس نہیں ہو رہا تھا میں جیسے ایک جانی پہچانی شخصیت میں سے ایک
اور شخصیت دریافت کر رہا تھا جس کا ایک نام ناہید بھی تھا اور وہ سوہن لال بھلّا کی بیٹی تھی
وہ ٹرے لے کر آئی اور میرے سامنے بیٹھ کر چائے بنانے لگی تو میں نے اس سے کہا

"مجھے کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے اپنی جس بیٹی کو آپ کی والدہ ابھی تک نوتی کہنے پر مصر ہیں اس
کے اس نام سے میں نہ تب واقف تھا نہ اب تک ہوں۔ میرے لیے حیرتناک بات یہ ہے کہ وہ
اب ناہید بھی ہے۔"

اس نے چائے کا پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا سر گھما کر اس دروازے کی طرف دیکھا جدھر سے اس کی ماں کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ پھر سر جھکا کر اپنے پیالے میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی ــــ "میں اپنے بوڑھے والدین کو اس حد تک پریشان نہیں کرنا چاہتی اچھا ہے اس وقت ان میں سے کوئی بھی آس پاس نہیں ہے آپ نے جو کچھ پوچھا ہے اس لیے بتا رہی ہوں اکتیس اگست کو میں اُن سے بچھڑ گئی تھی شاید آپ کو کچھ اندازہ ہوگا کہ سن سینتالیس میں کیمپوں کی کیا حالت تھی ہمارا کیمپ ڈی اے وی کالج میں تھا اپنے گھروں سے نکال کر وہاں تک ہمیں ملٹری نے پہنچایا تھا جس وقت ایک کنوائے واہگہ بارڈر جانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اچانک حملہ ہو گیا تھا اسی ہنگامے میں مجھے قصور کی طرف ہانک کر لے جایا گیا تھا اور بھی کئی لڑکیاں تھیں میرے ساتھ وہیں سے حوالی مجھے چھاٹ کر لے گیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ شادی بھی کر لی تھی وہ اتنا با اخلاق ثابت ہوا جس کی میں ہمیشہ تعریف کروں گی اسی وجہ سے میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں میری پہلی محبت عجیب حالات کا نتیجہ ہے لیکن مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ وہ بھی اسے اپنی پہلی محبت قرار دیتا ہے لیکن آپ کون ہیں؟ آپ کہہ رہے تھے نا کہ آپ نے تو شی کو دیکھا تھا اور اُسے ابھی تک یاد رکھے ہوئے ہیں "

میں نے بڑی مشکل سے چائے کے گرم گرم گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے کہا۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو محبت کرنے والوں کو خواہ مخواہ ڈسٹرب کر کے ذہنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ مجھے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے دلدادہ ہوتے ہیں آپ کی باتیں سُن کر اور آپ کو اتنے قریب سے دیکھ کر مجھے ایک غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں اس روز آپ کو دیکھتے ہی اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آپ وہی ہیں۔ اسی کشش میں سہگل صاحب کی دعوت قبول کر کے یہاں تک چلا آیا۔ صرف اسی لڑکی کو بیس برس کے بعد دیکھنے کے لیے جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا صرف سراپا یاد تھا۔ یہ میری بہت ہی احمقانہ حرکت تھی اور میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ اب تو میں سہگل صاحب کے بھی سامنے نہیں جا سکوں گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ابھی چلا جاؤں لیکن خدارا میری اس احمقانہ حرکت

کو معاف کر دیتے کہ جس کا تعلق میری موجودہ عمر سے نہیں بلکہ بیس برس پہلے کے ایک شرارتی لڑکے سے ہے!!

میں جب وہاں سے اٹھا تو وہ سخت حیرت میں مبتلا تھی کچھ کہہ بھی نہیں پا رہی تھی۔ مجھے گیٹ تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ساتھ آئی اور میں جب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سڑک کے پار پہنچ گیا، اس وقت بھی وہ گیٹ پر اپنے دونوں بازو لگائے سوچ میں غرق تھی۔ ...؛

ایک ٹہنی ہری ہری پتیوں والی

دلی پہنچ کر سب سے پہلے جوگندر پال کو فون کیا تھا کیونکہ جب وہ افریقہ سے ہندوستان آیا تھا تو
چندر بدر کے لیے لکھنؤ بھی آگیا تھا لیکن اُن دنوں میں باہر گیا ہوا تھا یہ غالباً ۱۹۶ء کی بات ہے۔
میں نے اُسے ریلوے اسٹیشن سے فون کیا تو اُس نے بتایا ۔ "آج میں لنچ پر ایک جگہ مدعو ہوں
تم بھی وہیں آجاؤ وہ بہت اچھے لوگ ہیں، بے حد ادب نواز ہیں۔ تمہیں بھی ضرور جانتے ہوں گے۔ میں
انہیں تمہارے بارے میں اطلاع کر دوں گا تو وہ تم سے ملنے کے لیے خود ہی دوڑے پڑیں گے۔ لیکن
تم تو اسٹیشن سے فون کر رہے ہو نا؟ ٹھہرے کہاں ہو؟ ـــ سنو یار، ایسا کرو، تم وہاں پہنچ جاؤ۔
تکلف مت کرنا۔ میری اُن سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوئی تھی۔ کرشن موہن نے کرائی تھی اسی
ملاقات کے وقت انہوں نے مجھے لنچ کی دعوت دے دی تھی اس بات کو سمجھتے ہو نا! ادب میں تکلفات
میں نہیں پڑتا۔ وہ تو لوگوں سے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ اصلیت کی دیواریں چھوٹے اور بیکار لوگوں
کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ ہم تو پیارے سے لوگ ہیں، جو کچھ لکھتے ہیں، پوری سچائی سے لکھتے ہیں اس لیے
ہمیں کسی سے بھی ملنے میں عار نہیں ہونی چاہیے اچھا یار تم وہیں آجانا مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے میری
بات مان لی تم سے یہی امید کرتا تھا اب ہماری ملاقات وہیں ہوگی چھ سٹیار، لودھی روڈ پر۔ سائی
سوتی رہو پیارے "

پال سے پہلی مرتبہ ملنے کی خواہش مجھے ٹھیک ڈیڑھ کے نو دھی روڈ لے گئی۔ چھ شرجا پر میرے لیے جس نے دروازہ کھولا وہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا لیکن خوش لباس اور سرخ و سپید اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تین جوان خوبصورت اور قبول لڑکیاں اس طرح مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں کہ مجھے فوراً راہ مہدی علی خاں کی اندو میش بیٹیوں کا خیال آ گیا اُن کے ممبئی میں پالی ہل والے فلیٹ میں گیا ـــــ تو وہاں میں نے ایسی ہی دلکش بیٹیوں کو قطار میں کھڑے اپنی طرف گھور گھور کر دیکھتے ہوئے پایا تھا راہ مہدی، علی خاں نے جس انداز سے مجھے اپنی بیٹیوں سے ملوایا تھا ٹھیک اُسی طرح گُدمرل داس سیدیلو اپنی بیٹیوں کے ساتھ مجھے متعارف کرائے گئے۔

"یہ میری بڑی بیٹی دیلا ہے یہ پرکرما ہے اور یہ سو ویر ہے۔"

پھر انھوں نے خود ہی ہنس کر یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ ـــــ "میں اپنی تیسری بیٹی کا ابھی تک کوئی رتی، رواج والا نام نہیں رکھ سکا۔ بچپن سے ہی اسے سو ویر کہتا چلا آیا ہوں۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا تھا ـــــ "اگر انھیں اپنے لیے رتی نام پسند ہو تو میں ابھی اُن کا نام کرن اسمسکار کیے دیتا ہوں"

سو ویر نے اپنے پاپا کے گلے میں فوراً بانہیں ڈال کر کہہ دیا تھا ـــــ "مجھے یہ نام پسند ہے۔ اسکول میں ابھی سو ویر بدل کر رتی کرا دوں گی لیکن اس موقع پر آپ آج ہی انھیں ایک شاندار دعوت دیجیے ابھی، اسی وقت۔"

جب پھول کھلے ہوں اور ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی ہو تو سماں بہت ہی سہانا ہو جاتا ہے۔ میں نے قہقہوں اور رنگ و بو سے بھرپور ماحول کا ایک ہی نظر میں کھڑے کھڑے جائزہ لے کر اندازہ لگا لیا تھا کہ گُدمرل پال ابھی تک نہیں پہنچا تھا اور یہ بھی شک گزرا تھا کہ وہ کہیں مجھے گُدمرل پال ہی سمجھ کر اتنی بے تکلفی تو نہیں برت رہے ہیں، اس لیے میں نے کہہ دیا۔ "میں لکھنؤ سے آیا ہوں پال کا دوست ہوں۔ پال کی طرح میرا بھی لکھنے کا مشغلہ ہے میں دراصل انہی کے کہنے پر یہاں اُن سے ملنے آیا ہوں"

سیدیلو صاحب نے بتایا ـــــ "ہم آپ کو جانتے ہیں یہ ہماری بہن خوش قسمتی ہے کہ آپ پہلے سے آپ کے درشن ہو گئے تشریف رکھیے۔"

اس کے بعد میں نے وہاں ایک اور ہل چل دیکھی تینوں لڑکیوں نے بھاگ بھاگ کر میز سجا دی۔

وہاں بہت سے لوازمات جمع کر دیے اور میں سہما سہما سا بیٹھا دیکھتا رہا۔ سہدیو صاحب بھی موڑھے کر باہر
چلے گئے۔ واپس آئے تو اُن کے بیگ میں میری کئی کتابیں تھیں، جنہیں انہوں نے فوراً ڈریر میں رکھوا دیا
میرے ہاتھ میں میرے برانڈ کا سگریٹ دیکھ کر وہ اُسی برانڈ کے کئی پیکٹ لے کر آ گئے تھے پھر الماری
کھول کر کچھ کتابیں اور رسالے بھی میرے پاس لے آئے بولے:

"ان سب میں آپ کی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں میں آپ کا دیرینہ (FAN) ہوں۔
آپ سے ایک مدت سے ایک سوال پوچھنے کی خواہش تھی آج وہ موقعہ اچانک آپ ہی نے دے دیا ہے
ملکیال صاحب نے یہ بتایا ہے کہ جو کچھ آپ لکھتے ہیں کیا وہ سب سچ ہوتا ہے؟

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

"میں نے آپ کی کریٹ (CREATE) کی ہوئی ہر فضا کو اور آپ کے ہر کردار کو ایسے بہت
قریب سے محسوس کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے آپ کے یہاں ساوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے یعنی حوالوں، تعویذات
اور طلسمات کی پرچھائیاں تک آپ کی کہانیوں پر نہیں پڑی ہیں پڑھنے والا ان سانسوں تک کو محسوس
کر لیتا ہے جو آپ اور آپ کے کردار لے رہے ہوتے ہیں"

اپنی تعریف سُن کر مجھے پسینہ سا آ گیا اُن کی تینوں لڑکیاں میرے سامنے کھڑی اپنے ابا کی باتیں
بڑے غور سے سُن رہی تھیں اور میری طرف بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔
قدردانی کے بعض لمحے بے حد پریشان کُن ہوتے ہیں یوں بھی تعریف سننا میرے لیے کبھی مفید خوراک
ثابت نہیں ہو سکا اور جو ادیب خوشی خوشی اُسے برداشت کر لیتے ہیں انہیں میں نارمل انسان نہیں
سمجھتا۔ اس لیے میرا جی فوراً چاہا اُٹھا کہ سہدیو صاحب کو سچ سچ بات بتا دوں۔

"دیکھیے جناب، اس وقت آپ مجھ پر سخت سے سخت تنقید کر دیتے تو مجھے واقعی اچھا لگتا یہ
نہیں کہ آپ خواہ مخواہ ہی میری خامیاں گنوانے بیٹھ جائیں میں چاہتا ہوں آپ اگر تحریر کرنے کی
صلاحیت رکھتے ہیں تو ذرا سی ادھر سے گفتگو کیجیے۔ آپ سمجھ گئے نا، میں اس وقت کتنی امبریسمنٹ
(EMBRASSMENT) محسوس کر رہا ہوں۔"

سہدیو صاحب کچھ نادم سے ہو کر بولے۔ "میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں نے جو سوال آپ سے
پوچھا تھا وہ بہت ہی سمپل (SIMPLE) تھا کیا آپ کو ایسا نہیں لگا؟ لیکن جو حقیقت ہے

"وہ میں نے بیان کر دی۔ شاید آپ کچھ تھکے تھکے سے بھی ہیں؟"
یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ڈاکٹر بیٹی ویا کی طرف دیکھ کر کہا ــــ ایک آدمی تو کل درج میں موجود ہے
کے آدھ تو؟

"معاف کیجیے گا آپ بیئر تو پی لیتے ہیں نا؟"
"اس وقت ضرور پی لوں گا ویسے ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے پاؤں میں کچھ تکلیف ہو جاتی ہے"

"کہیے تو درسکی حاضر کروں؟"
"جی نہیں میں دن کے وقت کبھی نہیں پیتا اس وقت آپ کے ساتھ بیئر پی لوں گا"
ویا دو مگوں میں بیئر بھر کر لے آئی ہمارے سامنے ایک منقش چوکی کیسٹ کر بیٹھ گئی
بولی ــــ "آپ نے اپنی ایک کہانی سماعدا میں ایسی ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے جو عمر میں آپ سے
بہت بڑی ہے اس وقت آپ کی عمر دس ایک سال ہی رہی ہو گی اور آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو اس کے
پاس گھس کر بیٹھنے اور اس کے بالوں کے گھنگھرالے میں بہت سکھ ملتا تھا پھر جب آپ اپنے ماما جی
کے وہاں سے چھٹیوں میں گھر لوٹے تو رات کے اندھیرے میں کبھی ملی ہوئی دیوار پر چلتے ہوئے اس کے
وہاں پہنچ گئے جب کہ دراصل وہ مر چکی تھی لیکن آپ نے اپنے حیرتناک تصور کی مدد سے اسے زندہ
دیکھ لیا وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی خط لکھ لکھ کر ادھر ادھر پھینکتی جا رہی تھی۔ اس نے آپ کی موجودگی
سے بے نیاز ہو کر اپنا کام جاری رکھا میں اس سلسلے میں صرف ایک بات جاننا چاہتی ہوں آپ نے
اپنے بچپن کی اس سکھ والی کیفیت کو تیس برس تک کیسے یاد رکھا؟ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے
اتنے عرصے کے بعد اس کہانی کو لکھا کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے جوان ہو کر اپنے اندر اسی سکھ کو نہ
صرف یاد رکھا بلکہ اس میں بہت زیادہ شدت بھی محسوس کی اور اسی شدت نے آپ سے یہ کہانی
لکھوائی ہو؟"
بیئر کے کئی گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر میرے اندر اچانک ایک جرأت سی پیدا ہو گئی تھی میں
نے اس لڑکی کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا۔ جس نے اپنے باپ کے سامنے ایک بہت ہی نازک مسئلے پر بات چیت
کرنے کی ہمت کی تھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ کی آمیزش بھی تھی اس کے
سر پر ڈھیلے ڈھالے لیکن گھنے اور چمکیلے بالوں کا ایک جنگل سا تھا۔ بالوں کے عین درمیان اس کی

مانگ میں سیندور کی ہلکی سی ریکھا بھی دکھائی دی

میں نے اُسے جواب دیا۔ "میں اُس سے انکار نہیں کرتا جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں۔ لیکن میرے بچپن میں مجھ پر جو کچھ بیتی وہ بھی اس سُکھ سے یکسر خالی نہیں تھی۔ یعنی جس کیفیت کو آپ سُکھ کا نام دے رہی ہیں!"

میں ہنس دیا۔ میری ہنسی میں وہ بھی شریک ہوگئی "لیکن آپ نے خود ہی تو اُسے سکھ کا نام دیا تھا۔"

"جی ہاں! شاید ایک نے نام سانگھ کہا تھا مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں اب تو۔"

"جی ہاں نے نام سانگھ! مجھے یاد آگیا۔"

"تو نے نام سے سُکھ اور سچ مچ کے ایک بالغ سکھ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے ایک معمولی سی سینسیشن (SENSATION) اور متحرک سینسیشن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کیا آپ نے یہ نہیں محسوس کیا۔ میں نے اپنے بچپن کی معصوم سینسوئل سینسیشن (SENSUAL SENSATION) کو کہیں بھی اتنا (INTENSE) نہیں ہونے دیا جسے آپ میری جوانی سے تعبیر کر رہی ہیں۔ میں سستے جذبات کو کہانی لکھتے وقت کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا ویسے کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟ لٹریچر کے تعلق سے آپ نے اب تک کتنا کچھ پڑھا ہے؟"

"کیا آپ ناراض ہو کر یہ سب پوچھ رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں آپ کے بارے میں جاننے کے لیے یک بیک بے تاب ہو اُٹھا ہوں کیوں کہ آپ نے بہت ہی اینٹلی جنٹ (INTELIGENT) گفتگو شروع کر دی ہے۔"

وہ میری بات پر زور سے ہنس دی اس وقت سید یو صاحب برابر سے بیئر کی ایک اور بوتل نکال لانے کے لیے اُٹھ کر چلے گئے۔ دیپالے میرے برابر تھوڑی سی جگہ خالی پا کر اپنی سپید سڈول کہنیاں ٹیک کر سر جھکا لیا اُس کے ڈھیلے سیاہ بال اُس کے کانوں پر اتر آئے وہ سر جھکائے جھکائے بولی "میں نے انگریزی میں ایم اے کیا تھا لارنس، ٹامس اور جان اُپڈائیک میرے پسندیدہ ادیب تھے پھر میری شادی ہو گئی بدقسمتی سے میرے ہسبنڈ کو لٹریچر یا اس قسم کے کلچر سے جس میں میری پرورش ہوئی ہے کوئی لگاؤ نہیں تھا وہ موٹر پارٹس کا بزنس کرتا تھا اب بھی کرتا ہے، دو نمبر کا دھندہ۔ اُس کی دلچسپی روپیہ کمانے میں زیادہ ہے اور رات کو گھر لوٹ کر شراب پینے اور لذیذ کھانا کھانے اور اپنی عورت کا خون نچوڑنے میں

کی میں اپنے بچے کے بڑا ہونے تک اُس کی پرورش کر رہی ہوں جو کبھی میرے پاس رہتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے باپ کے پاس بھی چلا جاتا ہے۔ لیکن ابھی حالات نے مجھے لٹریچر کے مطالعے کی طرف جیسے واپس کھینچ لیا ہے میرے پاس بیشمار کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے اس گھر میں یوں بھی کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پاپا کی وجہ سے میں یہاں رہ کر پوری طرح مطمئن اور خوش ہوں "

جس وقت اس نے اپنی بات ختم کی اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا میری نظریں اُن کے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہاں قیمتی صوفوں اور خوش رنگ قالین کے علاوہ دیواروں پر متعدد تصاویر اور پیتل کی منقش چیزیں آویزاں تھیں۔ شوکیس کے اندر دیس بدیس کی گڑیاں سجی ہوئی تھیں اور اُس کے اُوپر ایک بہت بڑی نٹ راج کی مورتی رکھی ہوئی تھی جو دروازہ کھلا ہوا تھا اس میں سے مجھے پریما اور سودیر اور دو ایک نوکر بہت تیزی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

سچدیو نے واپس آکر بیئر کی ایک اور بوتل بھی کھولی اور یہ بھی بتایا —— "آپ کے دوست کو میں نے فون کیا تھا انھوں نے معذرت کر لی ہے۔ کہا ہے کہ وہ ہم سب کے لیے دیگیاں بھوں کے پاس حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھانے کے بجائے کہیں اور کھالیں گے لیکن انھوں نے ہم سب کو اور آپ کو بھی ٹھیک نو بجے وہاں پہنچ جانے کے لیے کہا ہے کیونکہ پنڈت نہرو ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر انڈو پاک کلچرل کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے پہنچ جائیں گے۔"

سودیر نے دروازے پر نمودار ہو کر کہا —— "پاپا کھانا لگا دیا ہے"

ہم اپنے اپنے گلاس اُٹھاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے میز پر قسم قسم کے کھانے لگائے گئے تھے پریما اپنے ہاتھ میں پھولوں کا ایک بڑا سا ہار لیے کھڑی مسکرا رہی تھی مجھ سے بولی ——

آج آپ کی حیثیت یہاں ایک مہاپنڈت کی سی ہے اور اُس کے لیے آپ ہی ذمہ دار ہیں پلیز یہ ہار سودیر کے گلے میں ڈال کر اس کے نئے نام کا اعلان کر دیجیے وہی نام جس کا آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اعلان کیا تھا ہے۔

میں نے سودیر کی طرف متوجہ ہو کر دیکھا جو ایک کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ تیری بہن نے اپنے باپ کے آرٹ اور کلچر سے بھرپور گھر میں اپنے بالغ وجود پر اچانک ایک معصوم سی سنجیدگی بھی طاری کر لی تھی۔

سیدیو صاحب نے کہا" ذرا ٹھہر جائیے آپ سب لوگ یہ رسم اس دیو
ہو کر ادا کریں۔ جہاں میری بیوی کی تو ٹو ٹنگی ہوئی ہے۔ وہ آج زندہ ہوتی تو بہت خوش ہوتی۔ میں آپ لوگوں کی فوٹو بھی کھینچتا ہوں "

وہ جلدی سے ایک کیمرہ اٹھا لائے ہم سب دیوار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے سوویر
کے گلے میں ہار پہنا کر کہا۔ "لو آج سے تم ریتی سن گئیں ریتی سیدیو "
ریتی نے سر جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کیا میں نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔
" اس وقت تمہیں کوں سا تحفہ دوں میرے پاس بس ایک پین ہے کیا تم اسے قبول کروگی؟
"ضرور یہ تو میرے لیے واقعی سوویر بن جائے گا ہمیشہ سنبھال کر رکھوں گی؟"
سیدیو اور میں نے بیئر سے بھرے ہوئے گلاس کو اٹھا کر ریتی کو چیر ز کیا۔ اس
موقعہ پر مجھے ایک کتھک پیش کرنے کی اجازت دیجیے، صرف پانچ منٹ لوں گی ہاتھ جوڑ کر کہا
اس کے پاپا نے کچھ بے چینی دکھائی "تب تک کھانا ٹھنڈا نہیں ہو جائے گا۔ ایسکس
جلدی کرو۔"

پیر ما کر ساگھنگرو پہنے کتھک پیش کرنے لگی سیدیو صاحب نے گلاس ہاتھ سے رکھ دیا اور دونوں
ہاتھوں کو تھپتھپا کر تال دینے لگے۔

ویبا نے کیمرہ اٹھا کر ایک اور فوٹو اتاری اس کے بعد ہم سب کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔
ابھی ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ کال بیل بجی اور سیدیو صاحب سا
آٹھ سال کے ایک بچے کو اور چالیس برس کے ایک درمیانے قد کے صحت مند شخص کو لے کر باہر جا کر اپنے ساتھ
انہیں دیکھتے ہی ویبا کے چہرے پر ایک ناخوشگواری سی پیدا ہو گئی وہ بچے کو انگلی سے لگائے ہوئے اندر چلی گئی۔ یہ واقعہ میرے لیے بہت ہی پر
چھوٹے سے خاندان کے درمیان اچانک پہنچ گیا تھا جس کے کچھ اندرونی لیشان کن تھا کہ میں ایک ایسے
موجودگی میں کسی نے اس واقعہ پر گفتگو نہ کی۔ اندر سنگودی کو میرے ساتھ رسا احتلافات بھی تھے لیکن مری
کرم متعارف کرا دیا گیا۔ "آپ موٹر پارٹس کا بزنس کرتے ہیں اور آپ ایک بہت ہی مختصر الفاظ میں یہ کہہ
اندر سنگودی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا ہر چند کہ وہ بھی پہلے سا ادیب ہیں۔" اس کے بعد
سے میری طرح مدعو نہیں تھا۔

میں نے اُسے وہیں پہلی بار غور سے دیکھا کنپٹیوں پر دونوں طرف سفید ہوتے ہوئے بال، آنکھوں پر سادہ فریم کی عینک اور کوٹ کالر پر پھیلے ہوئے پیلے رنگ کی قمیص کے ڈاگ کالر۔ ہر چند کہ وہ سچدیو صاحب کے تئیں بہت مؤدب تھا لیکن پرکر ما اور ریتی کے ساتھ وہ قدرے بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اُس نے چہرے پر اس بات کے لیے ملال کی ہلکی سی جھلک بھی موجود نہیں تھی کہ تھوڑی دیر پہلے دیپا اسی کی وجہ سے کھانا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی اُس نے میری طرف کوئی بھی توجہ نہیں دی جو اتفاق سے چند منٹ پہلے تک وہاں ایک خاص مہمان کی حیثیت رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ سچدیو صاحب اور اُن کی دونوں بیٹیاں میری طرف بار بار پلٹیں اور ڈونگے بڑھاتی رہیں لیکن میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میری اہمیت اس موم بتی کی مانند لمحہ بہ لمحہ پگھلنے میں مصروف ہے میں نے کھانے سے ذرا جلدی ہاتھ کھینچ لیا اور اجازت لے کر ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن تک گیا تو ریتی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اُس نے مجھے ایک صاف ستھرا تولیہ ہاتھ پونچھنے کے لیے دیا اور بڑی احتیاط سے سرگوشی کی۔ "آپ ذرا دیپا دیدی کے کمرے میں تشریف لے چلیے۔"

اُس نے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جو بیڈروم بھی تھا اور وہاں ایک طرف الماری میں بیشمار کتابیں بھی لگی ہوئی تھیں وہیں ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز کے سامنے دیپا اور اُس کا بیٹا دِکی کھانا کھا رہے تھے۔ دیپا مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور مجھ سے معافی بھی مانگنے لگی "یہ میری بہت بڑی بدتہذیبی تھی کہ میں وہاں سے اُٹھ کر یہاں چلی آئی لیکن میں مجبور تھی پھر کبھی بتاؤں گی۔"

دِکی اپنی ماں کے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر باہر چلا گیا، جہاں اُس کے پاپا بیٹھے تھے پھر وہیں سے وہ واپس بھی چلے گئے دیپا نے مجھے اپنی کتابوں کی الماری کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کتابوں کے بارے میں اُس کا انتخاب واقعی قابلِ تعریف تھا۔ اپنے اس لٹریری خزانے کے بارے میں وہ بہت زیادہ جذباتی بھی نظر آئی کئی کتابوں کے بارے میں اُس نے ضرورت سے زیادہ تعریف کی۔ بعض کتابیں تو مقامی ادیبوں نے تحفتاً دی تھیں جنہیں اُس کے پاپا کبھی کبھی ڈنر پر مدعو کرتے رہے تھے لیکن اُن ادیبوں کے بارے میں اُس کی رائے اچھی نہیں تھی۔

"یہ لوگ بہت بھوکے اور لالچی ہوتے ہیں۔ عورت کو دیکھ کر تو بالکل پاگل ہو جاتے ہیں شاید اس لیے کہ اُن کے اپنے گھروں میں جو عورتیں ہیں، بالکل اَن پڑھ اور علم و ادب کے بارے میں کوری ہوتی

ہیں اب یہی سطریں دیکھیے ایک شاعر نے اپنی کتاب پر میرے لیے کیا لکھ دیا ہے ؟" میں تمہارے جیسی خوبصورت اور ذہین عورت سے اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا اور اس کتاب پر ایک اور شخص نے جو یہاں کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرر ہے لکھا ہے۔ "میں آپ کی دوستی پر فخر کروں گا۔" اسی طرح سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے صرف مجھے فلرٹ کرنے کے لیے

" اب بتلا سوچیے میں کیا میری تساطا کیا۔ ایک معمولی پڑھی لکھی عورت کو وہ آسمان پر بٹھانے کی فکر میں پڑ گئے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ لوگ صرف میرے جسم کے بھوکے ہیں لیکن اتنے اچھے شعر کہنے والے اور اتنی اچھی تنقید لکھنے والے عورت کے معاملے میں کس قدر سطحی ہیں!"

میں نے اُسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی " ہمارے ملک کا ہر ادیب نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہ اچھا ادب تخلیق کرنے کے علاوہ اپنے نچلے ماحول کی ساری سادگیاں سارے احساسات، الجھنیں اور محرومیاں بھی ساتھ ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے وہ سماجی دوستی کی سطح پر آپ کو سب ہی معمولی انسان نظر آئے گا۔ کہیں بھی کوئی تنگ وسعت نہیں لیکن اوپر کے طبقے میں بھی جو کھوکھلا پن ہے کیا اُسے اپنی لعنت یا بے زاری کا اظہار کر کے پوری طرح چھپایا جا سکتا ہے ؟"

میری بات سن کر وہ حیران ضرور ہوگئی لیکن پھر فوراً ہی مدافعت پر بھی اتر آئی " اوپر کے طبقے نے اپنے کھوکھلے پن کے باوجود بڑی شائستگی اور بڑے وقار کے ساتھ آرٹ اور لٹریچر کی سرپرستی بھی تو کی ہے۔ اسی طبقے کی وجہ سے آج ڈرامہ، آرٹ سنٹر، نمائشیں اور سیمینار قائم ہیں کیا آپ میرے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے ؟"

" اُن کی اسی سرپرستی نے لٹریچر کو عام آدمی سے دور بھی تو کر دیا ہے یہ ماحول رہتا تو ہمارے لکھنے والے اپنا رشتہ اپنے طبقے کے ساتھ زیادہ مضبوط کر لیتے انہیں اس قدر استحصالی بنانے میں کامیاب ہو جاتے کہ اوپر کے طبقے یا تو اُن کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو جاتے یا پھر بھاگ کر کہیں اور جا چھپتے "

" آپ تو کلاس وار (CLASS WAR) کی بات لے بیٹھے میں صرف لٹریچر کی بات کر رہی تھی۔"

" لٹریچر بجائے خود ایک کلاس وار ہے اور ایک بہت ہی طاقت ور بغاوت بھی۔ وہ بڑے لوگوں کی سرپرستی کی وجہ استحصال کا شکار ہو جاتی ہے چونکہ دیکھنے سے اندھی بھی ہو جاتی ہے لیکن اُس کے پیش نظر عام آدمی ہمیشہ رہتا ہے۔"

اُسی وقت پرکرما نے آکر اطلاع دی پاپا موٹر میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں وگیان بھون میں
دس منٹ میں پہنچ جانا ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

ویپا نے جلدی جلدی اپنے بال کھول ڈالے میرے سامنے خاموشی سے کنگھی اپنے گھٹنوں تک
پہنچنے والے خوبصورت بالوں کو سنوارتی رہی اُس کے چہرے پر شکست کے آثار نہیں تھے ایک نئے
استدلال نے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی اگرچہ اس نے اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ
اپنے نظریات میں تبدیلی کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے

بیڈ روم سے وہ میرے ساتھ ساتھ باہر نکلی پہلے کی طرح خوشگوار موڈ میں نہیں تھی بلکہ بے حد سنجیدہ
تھی۔ ہم سب وگیان بھون پہنچے تو ہال بھر چکا تھا یال کہیں دکھائی نہیں دیا لیکن ایک شخص نے ہمیں اندر لے جاکر
بالکل آخری قطار میں بٹھا دیا جہاں چند سیٹیں ابھی تک خالی تھیں۔ پنڈت نہرو کی تقریر کے بعد ہندوستان
اور پاکستان کے وفود کے سربراہوں نے جوابی تقریریں کیں کچھ دوسرے مقررین بھی بلائے گئے۔ سید
احتشام حسین نے ترقی پسند نظریات کے مطابق تقریر کی تھی جس پر پریزیڈیم (PRESUDIUM)
کے ایک رُکن رام دھاری سنگھ دنکر نے انہیں بار بار ٹوکا لیکن ہال میں موجود ترقی پسند ادیبوں نے
دنکر جی ہی کو ہوٹ کیا۔

افتتاح کے بعد ہم سب ایک شاندار اور وسیع شامیانے کے نیچے کافی کے لیے نکل گئے وہاں کرشن چندر
خواجہ احمد عباس، میرزا ادیب، ابن انشا، ابراہیم جلیس، اپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، حفیظ جالندھری،
پروفیسر موہن سنگھ، امرتا پریتم، پرتھوی راج کپور، ذوالفقار احمد بخاری، ساحر لدھیانوی، بلراج ساہنی،
بھیشم ساہنی، واجدہ تبسم، صغیر احمد صوفی، جوگندر پال کرشن موہن وغیرہ
ہزاروں ادیب، شاعر، اداکار اور موسیقار جمع تھے۔ بعض سے میری پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔
بعض کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ اس بھیڑ میں ویپا ہی میرے ساتھ چپکی چپکی سی گھومتی رہی۔ وہ ہر اہم آدمی
سے متعارف ہونا چاہتی تھی اور اُن کے ساتھ صرف ہاتھ ملا کر ہی بہت خوش ہو جاتی تھی وہاں کئی دوسرے
پیشہ ور کیمرہ مین گھوم رہے تھے وہ ایک کیمرہ مین کو مستقل اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھی ادیبوں کے ساتھ تصویر
کھنچواتے وقت اس کا چہرہ ایک عجیب سے فخر سے کھلا ہوا ہوتا تھا میں اُن لمحوں میں اس کا چہرہ بڑے
اشتیاق سے دیکھتا رہا دوسرے چھوٹے بڑے ادیب بھی اُس کی شخصیت سے بے حد متاثر نظر آتے

تھے اگرچہ وہ سب اس بات کے بھی متمنی تھے کہ ہر ممکن طریقے سے پنڈت نہرو کے ساتھ اُن کی فوٹو اتاری
جا سکے۔ پنڈت نہرو کے بعد اُن کے لیے دوسری بڑی کشش اپنے قلم کار ساتھیوں کی موجودگی تھی۔ لیکن دیپا اور
دوسری بے شمار لڑکیاں اور عورتیں بھی جو اُن کی فین (FAN) تھیں، تیسری کشش کے دائرے میں
آ گئی تھیں۔ ایسی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں جہاں علمی موضوعات پر لمبی لمبی اور خشک بحثیں کی جاتی ہوں
وہاں رنگ برنگے لباسوں اور خوبصورت چہروں والی لڑکیوں اور عورتوں کی موجودگی کی وجہ سے سامعین سارا ا
لیپا بھول جاتے ہیں

جس وقت میں اتی انتا کے پاس کھڑا اس کے ہونٹوں کے اچانک دُم آلود ہو جانے کا سبب
پوچھ رہا تھا دیپا مجھے تلاش کرتی ہوئی میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ اتی انتا کے ساتھ بھی ایک فوٹو کھنچوانا
چاہتی تھی لیکن اتی انتا نے یہ کہہ کر معذرت کر لی "میں ایسا بد صورت چہرہ لیے ہوئے اتنی خوبصورت
لڑکی کے ساتھ تصویر نہیں کھنچواؤں گا۔"
یہ کہہ کر اُس نے ابراہیم جلیس کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے بھیڑ میں کھو گیا۔ دیپا مایوس تو ضرور ہوئی
لیکن اس نے مجھ سے کہا ـــــ "میں پاپا سے کہہ کر آئی ہوں۔ وہ پھر کار اور سودیر کے کر چلے جائیں گے۔
ہم یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں آپ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"
وہاں سے تھوڑی ہی دور تروینی آرٹ سنٹر تھا۔ اُس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے کینٹین سے چائے
منگائی تھی۔ دیپا اس شام کے فنکشن پر اپنے تاثرات بیان کرتی رہی تھی۔ اُسے ان تمام ادیبوں کے نام
یاد تھے جن جن کے ساتھ اس نے تصویریں کھنچوائی تھیں اور باتیں کی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی جذباتی
اور مشتاق (AMBITIOUS) سی ہو رہی تھی لیکن اب جیسے اس کے اندر کا تلاطم سمندر پرسکون ہو چکا
تھا۔ وہ ان سب کے بارے میں بڑے ٹھہرے ٹھہرے اور متوازن انداز سے تبصرہ کر رہی تھی۔ جب میں نے
اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تو اُس نے گھٹیا طریقے سے میرا ہاتھ دبایا تھا اور فلاں ادیب نے تو اچانک میرے
کندھوں پر اپنا بازو پھیلا لیا۔ میں اس کی تصویر پھاڑ ڈالوں گی ـــ اور جب ہم اوپر آڈیٹوریم میں کتھک
دیکھ رہے تھے تو فلاں فلم پروڈیوسر میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا کیا تمہیں بھی ناچنے
گانے کا شوق ہے۔ کبھی ممبئی آؤ تو میرے ساتھ ٹھہرو یہ میرا کارڈ ہے" اُس نے ایک کارڈ مجھے دکھاتے
ہوئے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ اس نے فوٹو گرافر کی رسیدیں بھی پھاڑ کر پھینک دیں

"میں آپ سے سچ کہتی ہوں، مردوں کی اس دنیا میں پڑھی لکھی اور قدرے اچھے ناک نقشے والی عورت
اُن کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتی یا جیسے لاٹری کا ایک ٹکٹ!"

"میرے لیے تم کیا ہو؟"
میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا "شاید یہ نعمت، یہی لاٹری کا ایک ٹکٹ، میری ایک بہت ہی خوبصورت
بیوی ہے جو مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ اُس کے ساتھ میں اب بھی ایک محبوبہ جیسا برتاؤ کرتا ہوں اتنا تو آپ بھی سمجھتی ہی
ہیں کہ ایک بیوی اور محبوبہ میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن اگر یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی عورت میں یکجا ہو جائیں
تو وہ دو آتشہ بن جاتی ہے اگر میں دوسرے آدمیوں کی طرح افسردہ (FRUSTRATED) ہوتا تو
شاید اس وقت مجھ سے بھی کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی جو تمہیں مجھ سے بہت دور کر دیتی!"
میں نے اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں
میں پہلی مرتبہ ایسی توجہ سے جھانک کر دیکھا تھا وہ میری آنکھوں میں بہت دیر تک ڈبڈبی ڈبڈبی دیکھتی رہی تھی
اُس نے اچانک میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا "جسے
آپ فرسٹریشن (FRUSTRATION) کہتے ہیں۔ اس کی کوئی ایک قسم ہرگز نہیں ہوتی ہم بہت خوش
بھی ہیں بہت سکھی اس خوشی کے پیچھے اداسی کی ایک لہر تو چلتی ہی رہتی ہے۔ اُداسی کا ایک پورا دیا جیسے الیکن میں
اُسے دیانت کرنے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پا رہی
میں اتنی خوش ضرور ہوں کہ آپ کے ساتھ بہت تھوڑے I HATE BEING A VAMP
سے وقت میں بہت سی باتیں کر سکی ہوں اب اور زیادہ نہیں رک سکوں گی۔ کیا آپ مجھے گھر تک چھوڑ آئیں گے
پاپا نے کہا تھا، اکیلی مت آنا وہ آپ کا بھی انتظار کر رہے ہوں گے"
یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی — "آیئے"

م کسور ۲

آہٹ سی درِ دل پر

طراح آج دفتر سے لوٹا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا دن بھر کی تھکان کے علاوہ ایک افسردگی بھی اس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھی۔ اُس نے اسکوٹر روک کر ڈیوڑھی میں رکھا اور اس کی ماں جلدی سے باہر آ گئی۔ وہ دعا کی منتظر تھی۔ صبح دفتر جاتے وقت طراح نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کو دعا کو ساتھ لے کر ہی گھر آئے گا وہ دن بھر اس کی منتظر رہی تھی بہت بے چین بھی رہی تھی کبھی کبھی اسے سُونے اور ویرانے گھر میں بہار آ جانے کے تصور سے مسکرا بھی اٹھی تھی لیکن اُس نے طراح کو اکیلا دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ طراح اُداس دکھائی دے رہا تھا اس لیے اُس نے دعا کے آنے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا سمجھ گئی کوئی بات ضرور ہوگی محنت کرنے والوں کی زندگی میں ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے

طراح اپنے کمرے میں چلا گیا

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ بہت ہی خوب صورت تھا ہر ماں کو اپنے بچے خوبصورت لگتے ہیں لیکن وہ سچ مچ خوبصورت تھا۔ لمبا، صحت مند، خوش پوش، اٹھائیس سال کا جوان۔

وہ اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا کچھ دیر تک بیٹھا ہی رہا پھر اُٹھ کر کوٹ اُتارا پھر اُسے ہاتھ

من لیے لیے وارڈروب کے سامنے کھڑا رہا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس کی ماں اسٹوو پر چائے کے لیے پانی رکھ کر برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھی اُسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ سویٹر بنے کی سلائیاں بھی چلاتی جاتی تھی۔ بیٹے کی کیفیت دیکھ دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی کچھ ایسی کیفیت اُبھر آئی تھی جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو اُسے سب معلوم ہو یقیناً وہاں ڈٹ گئی ہوگی یا اس کے ڈیڈی ان دونوں کے بیچ میں دیوار بن گئے ہوں گے یا ہو سکتا ہے وہ اس سے محبت نہ کرتی ہو یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

چائے تیار ہو گئی

وہ طراح کو بلانے کے لیے گئی وہ پھر کرسی پر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا تھا مسز دیال نے مسکرانے کی کوشش کی اس کے سر کی پشت کو پیار سے تھپتھپایا بولی۔

"چل چائے پی لے۔"

وہ ماں کی آواز سن کر چونک گیا۔

لیکن بغیر کچھ کہے باہر آ کر چائے کی میز کے سامنے بیٹھ گیا گھر پہنچ کر آدھ گھنٹے میں ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اپنی اُداسی پر قابو نہیں پا سکا تھا بلکہ اس میں اضافہ سا ہوتا چلا گیا تھا۔

جب وہ چپ چاپ چائے پی رہا تھا، اس کی ماں کی نظریں ایک کونے میں میز پر رکھے ہوئے وبھا کے پورٹریٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے اسی سے پوچھنا چاہتی ہو "کیوں ری تو نے یہ کیا کیا؟" ایک حسین و دلکش چہرہ۔ دل کو ٹٹولتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ ماتھے اور گالوں پر ایک حسین بے نیازی سے گرے ہوئے تراشیدہ بال جس دن طراح یہ تصویر گھر لے آیا تھا اس کی ماں نے اُسے پسند کر لیا تھا اس کے بعد اس نے ہر لمحہ اس خوبصورت بہو کو اپنے گھر میں چلتے پھرتے اور باتیں کرتے محسوس کیا تھا ان کے لیے الگ کمرے کی سمت سوچا تھا اُن کی آزادی اور آسائشوں کے متعلق سوچا تھا یہ بھی سوچا تھا کہ وہ اپنے سارے زیورات بہو کے حوالے کر دے گی جنہیں اس نے برسوں سے سینے سے لگائے رکھا تھا اور یہ بھی سوچا تھا جب وہ اپنے بیٹے کو اس کے حوالے کرے گی تو اُسے اس کی پسند اور ناپسند کی ساری باتیں بھی بتا دے گی یہ حقیقت بھول کر کہ طراح اور وبھا اکثر ملتے تھے۔ اور وبھا سے اس کی کوئی بات چھپی نہیں رہ گئی ہوگی۔ اس نے وبھا سے آج شام کی ملاقات کے

وقت بھی کہنے کے لیے بہت سی باتیں طے کر رکھی تھیں لیکن ملراج کی اداسی نے تو ساری فضا ہی بدل دی تھی جیسے کوئی جیر چلتے چلتے رک گئی ہو۔ کوئی اچانک بکھر گیا ہو۔ آس پاس کی کچھ مانوس آوازیں یکایک سائیں دیا سدھ ہو گئی ہوں جن کی وجہ سے زندگی اور حرکت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔
ملراج نے ماں کو وسھا کی تصویر کی طرف اتنے انہماک سے دیکھتے ہوئے پایا تو اس نے بہت دھیرے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

ماں اتم نے پوچھا نہیں کہ میں وسھا کو کیوں ساتھ نہیں لایا؟"

مسز دیال نے پھر اسی یقین کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کہ وہ جب سب کچھ کہتی ہے تو کیا پوچھے لیکن اس کی آنکھوں میں اس امید کو بھی حاملا اٹھی ہو سکتا ہے جو کچھ پیش آیا ہے وہ عارضی ہی ہو۔ صرف چند ہی روز کی بات، اس لیے وہ مسکرا دی

وہ ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن پھر آہستہ سے بولا۔
"ماں! میری زندگی میں ایک بہت ہی عجیب سی بات ہو گئی ہے۔ اس کے لیے پچھلے چند سال سے حالات بن رہے تھے میں تمہیں بتا نہیں سکا کئی بار سوچا بتا دوں لیکن نہ جانے کیوں بات میری زبان پر آکر رہ جاتی تھی۔"

وہ چند منٹ تک خاموش رہا
مسز دیال کا جیسے دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر بولی
"ملّی تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"
"ماں! تمہیں معلوم ہے میں اپنے دفتر میں جب ایک اسسٹنٹ کی حیثیت سے پہلی بار گیا تھا تب میری تنخواہ ڈی اے اور ہاؤس الاؤنس وغیرہ ملا کر دو سوا دو سو ہی بنتی تھی۔ میں دس بجے کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے لیے صبح سات آٹھ ہی کے بس پکڑ کر دفتر چلا جاتا تھا اور شام کو صرف اسی لیے چھ سات بجے تک دفتر میں کام کرتا رہتا تھا کہ اس وقت واپسی کے لیے بھی آسانی سے بس مل جاتی تھی۔ میرا ایک افسر مجھے بہت زیادہ محنتی سمجھ کر بہت خوش ہو گیا اور مجھ پر اپنی نوازشیں برسانے لگا تھا۔ یاد ہے؟"
اس کی ماں کو یہ بات بہت اچھی طرح یاد تھی اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک شفیق مسکراہٹ

اُمی بولی

"ہاں!"

"اُس افسر نے مجھے اپنا پی اے مقرر کر لیا تھا۔ میری تنخواہ میں پچاس ساٹھ روپوں کا اضافہ کر دیا تھا اس اضافہ کی وجہ سے میں نے تمہارا اسکول جانا چھڑا دیا تھا تمہاری بینائی کمزور ہوتی جا رہی تھی تم نے مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا کہ میں تمہیں بھی غیر ضروری محنت نہ کرنے دوں ـــ اپنے افسر کے لیے میرے دل میں احترام اور عزت پیدا ہونی چاہیے تھی نا، لیکن ماں! میں اس سے سخت نفرت کرنے لگا تھا اس کے قریب رہ کر میں کبھی خوشی محسوس نہ کر سکا تھا ہر وقت جی چاہتا' کسی نہ کسی بہانے سے اس کے ساتھ لڑ پڑوں۔ اُسے خوب گالیاں دوں۔ اُس کے ساتھ دورے پر رہتے ہوئے کئی بار ہم دونوں ڈاک بنگلہ میں اکیلے رہ گئے اور میرے دل میں آئی اس کی جان لے لوں یہ بات میں پاگلوں اور وحشیوں کی طرح سوچا کرتا تھا لیکن میں اس کی جان کبھی نہ لے سکا وسما سے میں اسی زمانے میں ملا تھا وہ کالج میں پڑھ رہی تھی میں اُن کے ہاں جاتا تھا تو وہ بہت خوش ہو جاتی تھی۔ میرے افسر کو ہمارے ملنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مجھے اُس سے نفرت اس لیے بھی ہوتی تھی کہ وہ مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کی اتنی آزادی کیوں دیئے ہوئے ہیں۔"

"ملی! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ یہ کیا بک رہا ہے؟"

مسز دیال نے حیران ہو کر پوچھا اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی تھا

ماں! میں پاگل نہیں ہوں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے سن لو مجھ پر جو بیتتی رہی ہے اُس کا میں نے تمہیں کبھی پتہ بھی نہیں چلنے دیا اپنے اندر بہت ساری الجھنیں لیے لیے میں تمہارے ساتھ ساتھ رہتا ہوں۔ نفرت اور محبت کے طوفانوں نے مجھے کئی کئی راتیں سونے نہیں دیا۔ تمہیں کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں راتوں کو جاگتا رہتا تھا لیکن تمہیں بتا بھی نہیں سکتا تھا دھیرے دھیرے میرے دل میں باپ اور بیٹی دونوں کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی مجھے دونوں ہی بڑے خود غرض اور مکار معلوم ہونے لگے۔ جیسے دونوں مل کر مجھ پر اپنا جال پھینک رہے ہوں۔ انہی دنوں میرے دماغ میں اُن سے انتقام لینے کے لیے ایک عجیب سی ترکیب آ گئی میں اُن سے دور ہو جانے کے بجائے اُن پر حاوی ہو جاؤں" اُن سے بہت اونچا ہو جانے کی اسکیمیں سوچنے لگا میں ایم اے تو تھا ہی کچھ دوسرے ٹیکنیکل تجربے

بھی رکھتا تھا جب سینٹرل گورنمنٹ کے تحت آئی اے ایس کا کمپی ٹیشن ہوا تو میں بھی امتحان میں بیٹھ گیا یہ فیصلہ میں نے ایک عجیب سی ضد اور ارادے کے تحت کیا تھا۔ مجھے یقین تھا میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جس ترقی کو میں حاصل کرنا چاہتا تھا اُسے ضرور حاصل کر لوں گا جس وقت میں نے یہ فیصلہ کیا تھا اُس وقت قدرت شاید میرے ارادے کے سامنے جھک کر مسکرا دی تھی اور میں سچ مچ افسر بن کر پھر اسی دفتر میں تعینات ہو کر آ گیا تھا۔ اُس دن تم کتنی خوش ہوئی تھیں ماں یاد ہے تم نے ست سنگ کرایا تھا اپنے محلے اور شہر کی کتنی ساری عورتوں کو بلایا تھا۔ پتا جی کے مرنے کے بیس سال بعد اس گھر میں پھر خوش حالی اور آسودگی نے قدم رکھا تھا اُس دن تم نے پتا جی کو بہت یاد کیا تھا۔ اُن کی تصویر کے سامنے کتنی دیر کھڑی روتی رہی تھیں۔ میں چھپ کر دیکھتا رہا لیکن میرا دل ایک اور ہی خوشی اور اطمینان سے بھرا ہوا تھا اس عہدے کو پا کر میں نے اپنے بوڑھے افسر اور اُس کی بیٹی سے بدلہ لے لیا تھا وہ ایک عارضی افسر تھا جو نیچے سے ترقی کرتے کرتے اوپر آیا تھا لیکن میرے آئی اے ایس بنتے ہی وہ پھر ایک سیڑھی سے نیچے کھسک گیا تھا۔ اب وہ اوپر کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چند سال بعد اُسے پہلے گریڈ ہی پر ریٹائرڈ ہو جانا پڑے گا اب وہ میرا ڈپٹی کہلائے گا میں طلب کروں گا تو وہ میرے سامنے کھڑا رہے گا اُسے میرے ایک ایک اشارے کا منتظر رہنا ہوگا میں چاہوں گا تو اُسے ڈانٹ بھی دوں گا۔ اور اس کی لڑکی کی محبت کو ٹھکرا کر میں اُسے ایک ناقابلِ بیان دُکھ اور تکلیف بھی پہنچا سکوں گا۔ میرا دل اسی خوشی سے بھرا ہوا تھا "

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے للی، تو ایسا تو کبھی نہ تھا۔ تیرا دل تو بہت نرم ہے میں نے تجھے اتنی محنت سے پالا پوسا ہے میری محنت تیرے اندر اتنا غصہ اور ایسے خیالات کیسے پیدا کر سکتی ہے جو کچھ تیرے دل میں آ رہا ہے وہ تو بہت عجیب ہے ایک مہرباں اور اچھے افسر کو دکھ پہنچانے کی بات تو نے کیوں سوچی، آخر کیوں میرے لال؟"

یہ کہتے کہتے مسز دیال روہانسی ہو گئی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اس نے اپنے بیٹے کی طرف انتہائی ہمدردی سے دیکھا۔

"ہاں، تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ کون ہے؟"

ملراج کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے چہرے پر ایک ندامت سی اُبھر آئی۔
بڑی ہی کربناک ندامت،،
مسز دیال کے چہرے پر ڈر اور خوف کی پرچھائیاں چھا گئیں
ملراج نے بتایا
"اس کا نام شری دھر شرما ہے"
یہ سن کر اس کی ماں نے زور سے میز پر سر ٹیک دیا اس کے بعد خاموشی چھا گئی
کتنی دیر تک ماں اور بیٹے کی زباں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا جس کمرے میں وہ بیٹھے تھے،
وہاں کی ہر چیز نے سانس روک لی تھی۔ ہر چیز اُن کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی تھی
ملراج سر اُٹھائے بغیر ہی کہتا رہا

"مجھے پتاجی کے بارے میں بہت پہلے سے معلوم ہو چکا تھا جب میں اسکول میں پڑھتا تھا پتہ نہیں کیسے معلوم ہو گیا پتاجی کی خودکشی کا کارن بھی معلوم ہو گیا تم نے مجھ سے سب کچھ چھپا رکھا تھا تم نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے گھر کے اتنے بڑے واقعے کے بارے میں معلوم ہو معلوم نہ ہوتا تو اچھا تھا میرے دل و دماغ اتنی شدید نفرت اور الجھنوں سے خالی ہوتے لیکن ہمارے سماج میں ایسی باتیں کب چھپی رہ سکتی ہیں گلی، محلے، اسکول، کالج، زندگی کے ہر قدم پر ایک بات کانوں میں پہنچ جاتی تھی بات صاف اور سچ بھی نہ ہو جب بھی کڑیاں مل ہی جاتی ہیں اپنے آپ مل جاتی ہیں پھر سب کڑیاں مل کر ایک کہانی بن جاتی ہے میرا خیال ہے سبھی بچے اسی طرح کڑیاں ملا ملا کر سوچتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں جن کے سروں سے اچانک کسی حادثے سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ جاتا ہے۔

جب میں ٹرانسپورٹ کے محکمے میں پہلے پہل ملازم ہوا، اُسی روز شرما کا نام سنتے ہی میرے اندر نفرت نے جنم لے لیا تھا۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ مہرباں ہونا چاہتا تھا میں اس کے احسانوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں سمجھ گیا تھا، وہ میرے پتاجی کی خودکشی کا کارن بننے کے بعد اب مجھ پر اپنی شفقتوں کا سایہ ڈال کر مجھے بھی ذلیل کرنا چاہتا ہے وشما کو اور مجھے ملنے جلنے کی آزادی دے کر وہ ہمارے پریوار کے ساتھ اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے وابستہ کر دینا چاہتا ہے وہ اس بدنامی کو اور بھی نمایاں کر دینا چاہتا ہے جسے بھول جانے کی کوشش میں تم نے اپنا گھر اور شہر چھوڑ دیا اور مجھے بچپن سے لے کر

اب تک ایک اجنبی ماحول میں رکھے ہوئے ہو لیکن ماں بدقسمتی نے تمہارا اور میرا پیچھا یہاں تک بھی کیا ہے! پچیس سال گزر جانے کے بعد بھی اس شخص کا منحوس سایہ ہمارے سروں پر منڈلانے لگا ہے"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا مسز دیال ابھی تک میز پر سر رکھے ہوئے تھیں اُس نے ماں کی طرف محبت سے دیکھا میلے بالوں سے ڈھکا ہوا سر، وائل کی دھوتی میں لپٹا ہوا ادھیڑ تر پیکر۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن ماں! تم دکھی مت ہو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا دل پتا جی کے دل سے بہت بڑا ہے۔ تم میری پوری بات سنو میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا جب میں خود افسر بن گیا اور باپ بیٹی سے انتقام لینے کا وقت آیا تو یک بیک اُن کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہوگئی۔ کتنی عجیب بات ہے ماں جنہیں میں ذلیل و خوار کرنے کے لیے منصوبے بنا رہا تھا، اب انہیں پر رحم کھانے کو جی چاہتا ہے وہ مجھے مکار اور فریبی کے بجائے بہت ہی نیک اور معصوم دکھائی دینے لگے ہیں۔ اگرچہ وہ پہلے سے رتی بھر تبدیل نہیں ہوئے میرے ساتھ پہلے کی طرح پیش آتے ہیں لیکن میں بالکل بدل چکا ہوں دھرماسے پھر ملنے جلنے لگا ہوں تمہیں تو معلوم ہی ہے ماں، میں تمہیں دھرما کی کتنی باتیں بتا دیتا ہوں۔ تم بھی تو ہر وقت اس کی باتیں سننا چاہتی ہو مجھ سے جھگڑا بھی کرتی ہو کہ میں دھرما کو تم سے ملاتا کیوں نہیں؟ جب اس کے ساتھ ہر کہیں گھوم آتا ہوں تو کسی دن اُسے گھر کیوں نہیں لے آتا آج صبح تم سے وعدہ کر کے گیا تھا ناکہ آج دھرما کو ضرور ساتھ لے آؤں گا لیکن آج شرما جی نے اچانک خود دھرما کو ساتھ لے آنے کا پروگرام بنالیا وہ تمہیں اپنے گھر بلانا چاہتے تھے لیکن میں راضی نہیں ہوا۔ اس لیے انہوں نے آج خود ہی یہاں آنے کا پروگرام بنایا۔ میں انکار نہ کر سکا وہ آج سات بجے یہاں آئیں گے۔ سات تو بج گئے وہ اب آتے ہی ہوں گے میں جب دفتر سے آیا تو تم سے شرما جی کے بارے میں سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا اسی لیے دل بھاری بھاری سا تھا تم سنا پسند نہ کروگی میں جانتا تھا۔ تم شرما جی کو اچانک دیکھ کر کہیں گھبرا نہ جاؤ۔ اس لیے میں نے تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے ....

سب کچھ بتا دیا ہے ____

اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے ____ میں نے بتایا ناکہ اب میں اُن سے نفرت نہیں کرتا ___ میں نے اپنی نفرت پر قابو پالیا ہے"

باہر کچھ آہٹ سی سنائی دی۔
طراح جھٹ اٹھ کھڑا ہوا مسز دیال میز پر سر ٹیکے بیٹھی رہیں۔ وہ یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا
"وہ آ گئے ماں! اٹھو اُن کا سواگت کرو۔"
چند ہی لمحوں بعد تیموں مسکراتے ہوئے اندر آئے۔ طراح پچاس پچپن کے پیٹے میں شری دھرتا
اور بہت ہی پیاری شکل و صورت کی دکھا مسز دیال نے ابھی تک میز سے سر نہیں اٹھایا تھا۔ وہ تھا اور اس کا
باپ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ طراح نے ماں کے پاس جا کر اس کے کندھوں کو چھوا اور اُسے اٹھاتے ہوئے بولا
"دیکھو تو ماں! دن آئے ہیں!"
لیکن وہ اُسے اٹھاتے ہی حیرت زدہ سا ہو کر چیخ پڑا۔
"ماں، تمہیں کیا ہوا ہے ماں؟"
مسز دیال کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔
ہونٹوں پر ایک ناقابلِ بیان کرب ناک خاموشی تھی۔
تیموں نے سراسیمگی کے عالم میں اُسے اٹھا کر صوفے پر لٹایا طراح ٹک ٹک کر رونے لگا۔
فری دھر پوچھنے لگا
"انہیں کیا ہوا کہیں ہارٹ تو نہیں فیل ہو گیا ہے؟"
اُس نے روتے روتے جواب دیا۔
"مجھے بھی ڈر تھا کہ اتنی مدت کے بعد آپ کو دیکھ کر کہیں گھبرا نہ جائیں اسی لیے انہیں میں آپ
کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن مجھے کیا معلوم کہ انہوں نے میری پوری بات نہیں سنی تھی۔"
"پر یہ مجھے کیسے جانتی ہیں؟ میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا"
طراح شرما جی کی بات سن کر حیران ہونے لگا
پھر پوچھا۔
"کیا آپ والدہ سے پہلے کبھی نہیں ملے؟ پٹنہ میں جہاں پتا جی رہتے تھے یہ ..." اُس
نے طرف اشارہ کر دیا۔

ستری دھر نے اُس تصویر کو غور سے دیکھا لیکن انکار کے طور پر سر ہلا کر کہا "نہیں میں اس سے کبھی نہیں ملا۔"

ملراج حیرت سے اور غم کا بت گیا۔

یہ سوچ سوچ کر اس کا غم اور شدید ہونے لگا کہ اس کی باپ اور ماں کی موت کا کارن جو ستری دھر بتا رہا تھا، وہ کوئی اور ہی تھا!

* * * *